مشہور تھے۔ یہ عجیب بزرگ تھے۔ اپنے لباس، رفتار و گفتار میں سب سے نرالے
کالج کے تعمیری کام کی نگرانی کرتے تھے۔ کالج کا کوئی انجینئر نہ تھا انجینئر، نقشہ
نویس، افسر پیمائش خود سیّد صاحب ہی تھے۔ اُن کی ہدایت کے مطابق خاں
صاحب کام کی نگرانی کرتے تھے۔ سیّد صاحب ہر روز شام کو آتے اور
دن بھر کے کام کا جائزہ لیتے۔ جہاں کوئی غلطی ہوتی اُس کی اصلاح کرتے۔
خاں صاحب کو تصوّف سے بھی لگاؤ تھا۔ کبھی کبھی وہ طالب علموں کے
کمروں میں بھی آ جاتے اور اپنے اقوال سے مستفید فرماتے اور صوفیا نہ
دوہرے وغیرہ سُناتے۔ علاوہ اور خصوصیتوں کے ایک بڑی خصوصیت اُن
میں یہ تھی کہ بغیر گالی کے بات نہ کرتے۔ گالی اُن کا تکیہ کلام تھا۔ بیچارے مزدوروں
پر اُس کی خوب مشق ہوتی تھی۔ اس میں نئی نئی ایجادیں بھی کرتے تھے۔ لیکن اُن کو
کبھی یہ خیال نہ آتا کہ وہ سچ مچ گالیاں دے رہے ہیں۔ یہ اُن کے لئے معمولی سی
بات تھی۔ ایک روز کچّی بارک کے کونے والے مکان میں خاں صاحب
چارپائی پر لیٹے تھے۔ ایک طرف میر ولایت حسین صاحب بیٹھے تھے،
دوسری طرف میں تھا۔ اتنے میں گوالا آیا جو کالج کی گائیوں کا رکھوالا
تھا۔ خاں صاحب نے اُسے کسی بات پر اپنی زبان میں ڈانٹنا شروع کیا۔
گوالا نے کہا خاں صاحب گالیاں تو نہ دیجیئے۔ خاں صاحب نے میر صاحب
کی طرف پلٹ کر کہا۔ دیکھا میر صاحب میں نے اس مادر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔
کو کب کوئی گالی دی ہے۔ یہ حرام زادہ۔۔۔۔۔۔۔ خواہ مخواہ مجھ پر تہمت دھرتا
ہے۔ میں مارے ہنسی کے لوٹ گیا۔ خاں صاحب کو اس کا مطلق احساس نہ تھا کہ
انھوں نے کوئی گالی دی ہے۔ سیّد صاحب اُن کو اکثر چھیڑتے رہتے تھے۔ یہ
بھی اُن سے اکثر بے تکے سوال کرتے اور وہ بھی اُن کو بے تکے جواب دیتے

جو بہت ہنسی کے قابل ہوتے تھے۔

اُس زمانے میں جب کہ اسٹریچی ہال قریب تکمیل کے تھا اور آس پاس کے کمروں کی ابھی بنیادیں ہی پڑی تھیں۔ ایک دن میں اور خواجہ غلام الثقلین مرحوم مسجد مدرسہ کے ایک کمرے کی بنیاد پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے اتنے میں سید صاحب تام جھام میں آتے ہوئے نظر آئے۔ مسجد کی سیڑھیوں کے پاس اُتر گئے، ہمیں جو دیکھا تو پلٹ کر مجھ سے فرمایا کہ اس کے ساتھ مت پھرا کرو تم کو شیعہ کر لے گا۔ میں نے کہا حضرت اب تو لوگ شیعہ رہے نہ سُنّی (میرا اشارہ اُس مذہب کی طرف تھا جسے عام لوگ نیچری کہتے اور اُن سے منسوب کرتے تھے) فرمانے لگے، ایسے ایسا بنا لو تو جانوں۔

۱۸۸۱ء میں سر سید ایک وفد اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خاں آصف جاہ ۶ کے حضور میں حیدر آباد دکن لے کر گئے تھے۔ ایک بڑے جلسے میں جو نواب وقار الامرا بہادر مرحوم کی صدارت میں ہوا تھا مولانا شبلی نے بھی ایک فارسی نظم اس موقع کے مناسب اپنے خاص الحان میں پڑھ کر سنائی تھی جو لوگوں نے بہت پسند کی جلسہ برخاست ہوا تو ایک صاحب نے آگے بڑھ کر مولانا کے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ سید صاحب نے فرمایا، ہاتھوں کو کیا چومتے ہو، ان کا منہ چومو۔ (یہ اشارہ اُن کی خوش الحانی کی طرف تھا)

ایک شخص نے سر سید کو اس مضمون کا خط لکھا کہ "میں بہت کثیر العیال ہوں اور معاش کی طرف سے تنگ رہتا ہوں۔ آپ کسی ریاست میں یا سرکار انگریزی میں میری سفارش کر دیجئے۔ میں نے انگریزی تعلیم نہیں پائی مگر عربی کتب درسیہ پڑھی ہیں۔ جو کام آپ میرے لائق سمجھیں اُس کے واسطے میری سفارش کر دیں" سر سید نے اُن کو لکھ بھیجا "میری عادت کسی کی سفارش کی

نہیں ہے اور وجہ معاش کی تدبیر میرے نزدیک اس سے بہتر نہیں کہ آپ میری
تفسیر کا رد لکھ کر چھپوا دیں، خدا چاہے تو خوب بکے گی اور آپ کو تنگی معاش
کی شکایت نہیں رہے گی"۔

مولانا حالی لکھتے ہیں کہ جب میں علی گڑھ میں سرسید کے مکان پر ٹھیرا ہوا
تھا، خان بہادر مولوی سید فرید الدین احمد صاحب سب آرڈینیٹ جج کا
رقعۂ دعوت سرسید کے نام آیا۔ رقعہ کے خاتمے پر انھوں نے اپنا نام اس طرح
لکھا "جانی فرید" (یعنی گنہگار فرید)۔ سرسید نے اس کے جواب میں جو رقعہ
لکھا تو اس کے عنوان میں وہی لفظ لکھ دیے، اور "جانی فرید" سے رقعہ
شروع کیا۔

کرنل گراہم لکھتے ہیں، سرسید جب لندن میں تھے ایک بار ڈیوک آف
آرگائل نے ڈنر کی دعوت دی جب شراب سامنے آئی تو انھوں نے کہا "میں
نوح کی شراب نہیں پیتا، صرف آدم کی شراب پیتا ہوں۔"

مولانا حالی لکھتے ہیں "ان کا (سرسید کا) ایک آرٹیکل تہذیب الاخلاق
میں اس مضمون پر شائع ہوا تھا کہ اجماع جیسا کہ اہلِ سنت سمجھتے ہیں حجت
شرعی نہیں ہے۔ شیعوں میں سے ایک صاحب جو بنارس میں ملازم تھے، اس
آرٹیکل کو پڑھ کر خوشی خوشی ان سے ملنے آئے۔ پہلے ان سے کبھی ملاقات
نہیں ہوئی تھی سرسید سے۔ اس آرٹیکل کا ذکر کر کے کہنے لگے کیوں جناب! جب
آپ کے نزدیک اجماع حجت نہیں تو خلیفۂ اول کی خلافت کیوں کر ثابت
ہوگی؟ سرسید نے کہا حضرت! نہ ہوگی تو ان کی نہ ہوگی، میرا کیا بگڑے گا۔ وہ
یہ سن کر اور بھی زیادہ خوش ہوئے اور سمجھے کچھ پانی مرتا ہے۔ تھوڑی
دیر کے بعد کہنے لگے کیوں جناب! اس اتفاق کے وقت جب کہ

کچھ لوگ خلیفۂ اوّل کا ہونا چاہتے تھے اور کچھ جناب امیر کا، اگر آپ اُس وقت ہوتے تو کس کے لئے کوشش کرتے؟ سرسید نے کہا، حضرت مجھے کیا غرض تھی کہ کسی کے لئے کوشش کرتا۔ مجھ سے تو جہاں تک ہو سکتا اپنی ہی خلافت کا ڈول ڈالتا اور سو لسوے کامیاب ہوتا۔" یہ سُن کر اُن کا جی چھوٹ گیا اور جوتیاں پہن کر گھر کا رستہ لیا۔ سید نے ظرافت کے پیرائے میں مسئلہ خلافت کے متعلق اپنے عقیدے کا اظہار بڑے پُرلطف طریقے سے کیا ہے۔

سرسید پر اخباروں میں بڑی لے دے ہوتی اور آوازے کسے جاتے۔ جب کسی اخبار میں اُن پر کوئی چوٹ نہ ہوتی تو تعجب کرتے، چنانچہ تہذیب الاخلاق میں لکھتے ہیں "ہمارا حال اُس بڑھیا کا سا ہو گیا ہے جس کو بازار کے لونڈے چھیڑا کرتے تھے اور جب وہ چھیڑنے والے نہ ہوتے تو کہتی کیا آج بازار کے لونڈے مر گئے"۔

سرسیّد لکھتے ہیں کہ "ہمارے ایک دوست نے ہم سے نقل کی کہ ضلع سہارن پور میں ہمارے حال پر بحث ہو رہی تھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک صاحب نے کہا کہ وہ ہے تو کرسٹان، مگر ہماری قوم کی بھلائی اگر ہو گی تو اسی کرسٹان سے ہو گی۔" یہ نقل سُن کر میں بہت خوش ہوا اور میں نے کہا کہ اگر درحقیقت مجھ سے ایسا ہو اتو اس کرسٹانی خطاب پر ہزار مسلمانی نثار ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

صائب نے ایک ناواقف شاعر سے پوچھا کہ صائب کیسا شعر کہتا ہے۔ اُس نے نہایت دلی جوش سے کہا "آں قرمساق ہمہ خوش می گوید" صائب کہتا ہے۔ "جیسی عزت مجھ کو قرمساق کے لفظ سے حاصل ہوئی، اعلیٰ سے اعلیٰ خطاب سے بھی ممکن نہیں۔" اسی طرح خدا کرے کہ یہ لفظ کرسٹان میرے

لیے عزت قومی کا باعث ہو۔"

سرسیّد جب حیدرآباد تشریف لے گئے تو ریلوے اسٹیشن پر بہت سے اصحاب استقبال کے لیے آئے۔ مولوی اکبر نے جو حیدرآباد کے نہایت ممتاز اور باثر اشخاص میں تھے، آگے بڑھ کر مصافحہ کیا اور کہا لوگ آپ کو نبی یا رسول کہتے ہیں۔ آپ کے پاس کیا نشانی ہے۔ سرسیّد نے داڑھی اُٹھا کر اپنی رسولی دکھا دی۔

پروفیسر بارنی کوٹ نے جو لینن گراڈ کی یونی ورسٹی میں اُردو کے پروفیسر ہیں، اُردو نثر کا ایک انتخاب چھاپا ہے جس میں اُردو کے مشہور ادیبوں کے مضامین یا اقتباسات ہیں۔ اُن کو سرسیّد کے کلام میں اپنے مطلب کی کوئی چیز نہ ملی اور ملا تو یہ لطیفہ جو اُنھوں نے مولانا حالیؔ کی زندۂ جاوید کتاب حیاتِ جاوید سے نقل کیا ہے۔ مولانا لکھتے ہیں کہ۔ ایک دفعہ وہ ریل میں سوار تھے۔ کسی اسٹیشن پر دو انگریز اُن کی گاڑی میں آ بیٹھے۔ ایک اُن میں سے پادری تھا۔ اُس کو کسی طرح معلوم ہو گیا کہ سیّد احمد خاں یہی شخص ہے۔ سرسیّد سے کہا "مدت سے آپ کی ملاقات کا اشتیاق تھا۔ میں آپ سے خدا کی باتیں کرنا چاہتا تھا"۔ سرسیّد نے کہا "میں نہیں سمجھا آپ کس کی باتیں کرنا چاہتے ہیں؟" اُس نے کہا "خدا کی"۔ سرسیّد نے کمال سنجیدگی سے کہا "میری تو کبھی اُن سے ملاقات نہیں ہوئی، اس لیے میں اُن کو نہیں جانتا"۔ پادری نے متعجب ہو کر کہا "ہیں! آپ خدا کو نہیں جانتے"۔ اُنھوں نے کہا "مجھی پر کیا موقوف ہے جس سے ملاقات نہ ہو اُس کو کوئی بھی نہیں جانتا"۔ پھر کسی شخص کا نام لے کر پوچھا "آپ اس کو جانتے ہیں؟" پادری نے کہا "نہیں، میں اُس سے کبھی نہیں ملا"۔ سرسیّد نے کہا "پھر جس سے میں کبھی نہ ملا ہوں، نہ میں نے کبھی اُس کو اپنے ہاں کھانے پر

بُلایا ہو، نہ مجھ کو اُس کے ہاں کھانے پر جانے کا اتفاق ہوا ہو، اُس کو میں کیوں کر جان سکتا ہوں"۔ پادری یہ سُن کر خاموش ہو رہا اور دوسرے انگریز سے انگریزی میں کہا کہ "یہ تو سخت کافر ہے"۔

یہ تو خیال نہیں ہو سکتا کہ پروفیسر صاحب اسے سچ مچ سرسیّد کا اعتقاد سمجھے ہوں۔ لیکن انھیں اپنے سوویٹ طالب علموں کے لئے اس سے بہتر تحفہ اُردو ادب میں نہیں مل سکتا تھا۔

ایک اور لطیفہ جو میں پہلے بھی سُن چکا تھا اور جسے مولانا حالی نے بھی نقل کیا ہے سُننے کے قابل ہے۔ ایک بار وہ سخت بیمار پڑے تھے۔ ڈاکٹر نے تقویت کے لئے ایک دوا تجویز کی۔ پوچھا اس میں شراب تو نہیں۔ کہا ہو تو سہی یہ سُن کر پینے سے انکار کر دیا اور مومن کا یہ شعر پڑھا۔

عمر ساری تو کٹی عشقِ بتاں میں مومن   آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہونگے

سید صاحب کے ایک منشی تھے۔ اُن کا نام نجم الدین تھا۔ ذرا چھوٹے قد کے تھے۔ سید صاحب اُنھیں ٹٹو کہتے تھے اور اسی نام سے مشہور ہو گئے اب تک زندہ ہیں۔ اُن سے وہ خط لکھواتے یا کبھی مسودہ صاف کرواتے اُن کا خط بہت صاف اور اچھا ہے۔ اُن کی ظرافت، خوش طبعی اور شوخی کے چٹکلے اور لطیفے ایک دو نہیں سینکڑوں ہیں جو افسوس کسی نے جمع نہیں کئے۔ اگر ان کے خطوط جو تعداد میں بے شمار تھے یک جا مرتب ہو جاتے تو اُن میں علاوہ اور بہت سے نکتوں کے اُن کی ظرافت کے پُر لطف لطیفے بھی ملتے۔ ان کے خطوط کا جو مجموعہ شائع ہوا ہے وہ اصل خطوں کا عشر عشیر بھی نہیں۔ ظرافت دلیل ذہانت ہے اور زندہ دلی سلامت طبع اور رجائیت کی نشانی ہے۔ یہ کام کے بارگراں کے ہلکا کرنے میں سب سے بڑی معین اور ایک کثیر الاشغال

شخص کے لیے بعض کٹھن منزلوں کے طے کرنے میں سب سے اچھا بدرقہ ہو۔

یوں تو عمر کے ساتھ ساتھ اُن کے کام بھی بڑھتے گئے جو مختلف نوعیتوں اور حیثیتوں کے تھے لیکن اصل کام جس پر اُن کی پوری ہمّت اور توجہ صرف ہوئی وہ تعلیم تھا۔ باقی سب تحریکیں خواہ مذہبی یا سیاسی، معاشرتی یا ادبی سب اسی کے ذیل میں آجاتی ہیں۔

اُنیسویں صدی میں ابتری اور طوائف الملوکی ملک بھر میں پھیلی ہوئی تھی لڑائی جھگڑے، بدعنوانیاں، دست درازیاں عام ہوگئی تھیں۔ رعایا بدحال اور پریشان تھی ان حالات میں انتظام، انصاف اور امن وامان مفقود تھا۔ انگریز اپنی دانشمندی و تنظیم اور عیاری کے بل پر اور اہل ملک کی بے اُصولی، غفلت اور غدّاری کی بدولت **ملک** پر چھائے جا رہے تھے۔ جہاں جہاں اُن کا قبضہ ہو جاتا تھا وہاں انتظام اور امن وامان کی صورت بھی پیدا ہوگئی تھی۔ جب رفتہ رفتہ ان کے قدم جم گئے اور استقلال حاصل ہوگیا تو انھوں نے عدالتیں، انتظامی دفاتر، ڈاک خانے، تار، ریلیں، مدرسے اور یونی ورسٹیاں قائم کیں۔ جن لوگوں نے پہلے کی بدنظمی، غارت گری اور بدامنی دیکھی تھی وہ انگریزوں کی دانشمندی اور انتظامی قابلیت کے قایل ہوگئے اور ان کی حکومت کو بہت غنیمت سمجھنے لگے ہمارے زمانے میں جو بڑے بوڑھے رہ گئے تھے وہ اسی خیال کے تھے۔ سیاسی اور اقتصادی مسائل بہت بعد میں رونما ہوئے۔ جان ومال کی حفاظت اور امن سب سے مقدم ہے۔

سیّد احمد خاں نے ۱۸۵۷ء سے پہلے کی حالت بھی دیکھی تھی اور بعد کی بھی۔ اُنھوں نے دلّی کی سوسائٹی اور قلعہ کی صحبتیں اپنی آنکھ سے دیکھی تھیں۔ دیکھی کیا تھیں اُن میں پرورش پائی تھی۔ زوال بہت پہلے سے شروع ہوگیا تھا

مگر زوال کا احساس نہ تھا غفلت، بے حسی، آرام طلبی، کم ہمتی، خود غرضی عام تھی اور مستقبل سے بے خبر البتہ ماضی کا فخر ضرور باقی تھا۔ دنیا میں جو نیا انقلاب اور نئے حالات پیدا ہو گئے تھے وہ ان کی سمجھ میں نہیں آتے تھے، یہ نہیں کہ ان میں باہمت، اولوالعزم، بہادر، صاحب فکر اور ہمدرد لوگ بالکل نہ تھے کہیں کہیں ضرور تھے مگر عام اخلاق گر گئے تھے۔ قومی شیرازہ بکھر گیا تھا اور کوئی ایسا نہ تھا جو اس بکھرے ہوئے شیرازے کو ایک رشتہ میں منسلک کرے اور غفلت سے بیدار کر کے آگے بڑھنے کا صحیح رستہ دکھائے۔ انگریزی حکومت میں سب سے زیادہ خسارے میں مسلمان رہے ۱۸۵۷ء کے بعد تو اُن پر تباہی و بربادی اور مصائب و آلام کا آسمان ٹوٹ پڑا۔ انگریز ان کو ۱۸۵۷ء کی شورش کا بانی، اپنا دشمن اور اپنی حکومت کا غدار سمجھتا تھا۔ اور ان کو مٹا دینے پر تُلا ہوا تھا مسلمانوں کا قصور صرف یہ تھا کہ اُس نے حکومت ان سے لی تھی۔ وہ فاتح تھا اور یہ مفتوح مفتوح ہندو بھی تھے مگر ان کو وہ اپنا مخالف نہیں بلکہ دوست سمجھتا تھا۔ اِدھر ہندو مسلمان کا مفتوح رہ چکا تھا، کہ اُسے مسلمان سے بدلہ لینے کا اب موقع ملا ہے مسلمانوں کی حالت بڑی نازک اور قابل رحم تھی۔ وہ چکّی کے دو پاٹوں میں پِسا جاتا تھا۔ بہت سی جاگیریں اور زمینداریاں بغاوت کے الزام میں سرکار میں ضبط ہو چکی تھیں جو باقی تھیں وہ غفلت اور عیش پسندی کی بدولت ہاتھ سے نکلتی چلی جا رہی تھیں سرکاری ملازمت سے وہ ویسے ہی محروم تھا۔ اگرچہ اسلامی حکومت کو زوال آ چکا تھا لیکن ۱۸۵۷ء سے پہلے اور اُس کے بعد بھی قصبات وغیرہ میں مسلمانوں کا اثر باقی تھا اور باوجود اقلیت کے وہ اکثریت پر بھاری تھے۔ لیکن یہ چند روز کی بہار تھی۔ آفتاب اقبال گو غروب ہو گیا تھا لیکن ڈوبتے سورج کی ہلکی شعاعیں ابھی کچھ کچھ پڑ رہی تھیں۔ ان کے جاتے ہی اندھیرا ہو گیا۔

سید احمد خاں نے ۵۷ء کے طوفان میں خود بھی بڑی کھکھیڑ اُٹھائی تھی اور اپنی آنکھوں سے مسلمانوں کی تباہی اور بربادی اور ذلّت کے ایسے دردناک منظر دیکھے تھے جو بھلائے نہیں بھولتے تھے۔ اس وقت مسلمانوں پر مایوسی کی گھٹا چھائی ہوئی تھی خود ان پر بھی کچھ دن مایوسی کا عالم رہا۔ اور اس درد سے بے تاب رہے یہاں ہم انھیں کی تحریر پیش کرتے ہیں جس کے ایک ایک لفظ سے ان کا دردِ دل اور قوم کی سوگواری ٹپک رہی ہے۔

"بعوض اُس وفاداری کے تعلقہ جہان آباد جو سادات کے ایک نامی خاندان کی ملکیت اور لاکھ روپئے سے زیادہ ملکیت کا تھا مجھ کو دینا چاہا تو میرے دل کو نہایت صدمہ پہنچا۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ مجھ سے زیادہ کوئی نالائق دنیا میں نہ ہوگا کہ قوم پر تو یہ بربادی ہو اور میں اُن کی جائداد لے کر تعلقہ دار بنوں۔ میں نے اس کے لینے سے انکار کیا اور کہا کہ میرا ارادہ ہندستان میں رہنے کا نہیں ہے اور درحقیقت یہ بالکل سچ بات تھی۔ میں اُس وقت ہرگز نہیں سمجھتا تھا کہ قوم پھر پنپے گی اور کچھ عزّت پائے گی۔ اور جو حال اُس وقت قوم کا تھا مجھ سے دیکھا نہیں جاتا تھا۔ چند روز میں اسی خیال اور غم میں رہا۔ آپ یقین کیجئے کہ اس غم نے مجھے بڈھا کر دیا اور میرے بال سفید کر دیئے جب میں مرادآباد آیا جو ایک بڑا غم کدہ ہماری قوم کے رئیسوں کی بربادی کا تھا تو اس غم کو اور ترقی ہوگئی مگر اُس وقت یہ خیال پیدا ہوا کہ نہایت نامردی اور بے مروّتی کی بات ہے کہ اپنی قوم کو تباہی کی حالت میں چھوڑ کر میں خود کسی گوشۂ عافیت میں جا بیٹھوں نہیں اس کی مصیبت میں شریک رہنا چاہئے اور جو مصیبت پڑے اس کے دور کرنے میں ہمّت باندھنی قومی فرض ہے۔ میں نے ارادۂ ہجرت موقوف اور قومی ہمدردی کو پسند کیا"

اس کے بعد ان کے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ قوم کو اس ورطۂ مذلّت سے کیونکر نکالا جائے۔ بہت غور و فکر کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ اس کا علاج صرف تعلیم ہے اور تعلیم بھی جدید۔ یہ ساری آفت، مصیبت، پسماندگی اور محرومی تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے ہے۔ وہ دُنیا کے حالات سے بے خبر اور ترقی کی جدید راہوں سے ناواقف ہیں۔ جہالت تمام برائیوں اور عیُوب کی جڑ ہے لیکن مغربی تعلیم سے مسلمانوں کو سخت نفرت تھی۔ انگریز سے بھی زیادہ۔ انگریز جب ہمارے مُلک میں آئے تو ہمارے بزرگ اُن کی تہذیب و اخلاق اور ان کے اطوار و کردار کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ اُن کے طریقے ہم سے بالکل مختلف تھے۔ ان کا کھانا پینا، رہنا سہنا، بات چیت، لباس غرض کوئی بات ہم سے نہیں ملتی تھی۔ یہی نہیں بلکہ ہمارے بزرگوں کو اُن کی ہر چیز سے نفرت تھی اور اُس کو نجس سمجھتے تھے۔ دہلی کالج میں جب ایک اعلا انگریز حاکم آیا اور اُس نے مولوی صاحب سے مصافحہ کیا تو مولوی صاحب نے وہ ہاتھ الگ تھلگ رکھا اور اُس کے جاتے ہی رگڑ رگڑ کر دھو ڈالا۔ ہمارے اُس وقت کے ایک لغت نویس نے فرنگی کی یہ تعریف کی ہے "یکے از جانوران دریائی کہ گاہ گاہ بہ ساحل نمودار می شود"۔ اس جملہ کا آخری جُز بہت لطیف اور پُر معنی ہے۔ ہمارے بزرگ کہتے تھے کہ انگریز کاریگر اچھا ہے۔ بندوق، توپ اچھی بنا لیتا ہے۔ رہا علم سو اس سے بے بہرہ ہے۔ نئے مدرسوں اور کالجوں میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے اُسے وہ علم نہیں سمجھتے تھے۔ اور ان مدرسوں اور کالجوں کو مجہلے کہتے تھے۔ اسی لئے انھیں انگریزی تعلیم سے نفرت تھی۔ وہ کہتے تھے کہ یہ مسلمانوں کو مذہب سے منحرف کرنے اور عیسائی بنانے کی ترکیب ہے۔

اس تعصب کا توڑنا آسان کام نہ تھا۔ اس میں اہلِ علم اور عوام ایک تھے یہ بڑا سخت مرحلہ تھا۔ جب سرسیّد نے اس منزل میں قدم اُٹھایا تو ہر طرف سے مخالفت

کا طوفان برپا ہوگیا اور انھیں کرسٹان، ملحد، کافر کے خطاب عطا ہوئے۔ لوگوں کا عام طور پر یہ خیال تھا اور کسی قدر صحیح بھی تھا کہ مغربی تعلیم خصوصاً سائنس کے مطالعہ سے نوجوانوں کے عقائد متزلزل ہوجاتے ہیں، ان کا ایمان کمزور ہوجاتا ہے اور دہریت اور الحاد کی طرف میلان بڑھ جاتا ہے۔ اس خطرے کی روک تھام کے لیے سید کو مذہب کی قلمرو میں دخل دینا پڑا۔ اور جس طرح خلافت عباسیہ کے زمانے میں جب یونانی فلسفہ اور علوم طبیعی کے رواج نے لوگوں کے دلوں میں شکوک پیدا کئے تو علمائے اسلام نے اُن کے توڑ میں مذہب کی حفاظت اور حمایت کی کوشش کی اور انھیں کوششوں کا نتیجہ علم کلام ہے۔ اسی طرح اس زمانے میں جدید فلسفہ اور سائنس کے رواج سے جو مذہب کی طرف بدظنی اور روگردانی پیدا ہوچلی تھی، اس کے مقابلے کے لئے سرسیّد نے نیا علم کلام ایجاد کیا۔ اور اس بات کے ثابت کرنے کی کوشش کی کہ جدید فلسفہ اور سائنس سے اسلام کی حقّانیت پر کوئی حرف نہیں آتا۔ اور ان مسائل اور خیالات اور توہمات کی تردید کی جو جزو اسلام سمجھے جاتے ہیں مگر درحقیقت اسلام سے انھیں کوئی تعلق نہیں۔ سرسیّد نے جب مسلمانوں میں مغربی تعلیم کی ترویج کا بیڑا اُٹھایا تھا تو لازم تھا کہ اُس سے جو خرابیاں پیدا ہوں ان کے رفع کرنے کی تدبیر کی جائے۔ یہ بڑی وجہ تھی کہ انھیں مذہبی مسائل میں دخل دینا پڑا۔ اور جو تفسیر قرآن اور بے شمار مضامین لکھنے کی محرک ہوئی۔

یہ کام یہیں ختم نہیں ہوجاتا۔ اُسے جس طرح اپنے ہم قوموں سے لڑنا جھگڑنا پڑا۔ اسی طرح انگریزوں سے بھی مقابلہ کرنا پڑا۔ انگریزوں کے دلوں میں مسلمانوں کی طرف سے بہت سخت بدظنی اور عداوت جاگزیں تھی۔ اس میں دو قسم کے لوگ تھے۔ ایک وہ جو اسلام کو مانع ترقی خیال کرتے تھے اور اسلام پر طرح طرح کے بہتان اور اعتراض کرتے تھے۔ خطبات احمدیہ، ابطال غلامی

اور بے شمار مضامین انھیں خیالات کی تردید میں لکھے۔ دوسرے وہ جو مسلمانوں کو انگریزی حکومت کا بدخواہ اور غیر وفادار اور اپنی حکومت کے حق میں باعث خطر سمجھتے تھے۔ پہلے گروہ میں مشنری اور مذہبی خیال کے لوگ تھے، اور دوسرے گروہ میں ارکان حکومت۔ پہلا مسئلہ عام تھا اور وہ صرف ہندستان کے انگریزوں تک ہی محدود نہ تھا۔ البتہ دوسرا مسئلہ خاص طور پر اُن انگریزوں سے متعلق تھا جن کے ہاتھ میں حکومت کا نظم ونسق اور اقتدار تھا اور اس کے لئے فوری توجہ کی ضرورت تھی۔ اس میں سرسیّد کو بڑی جد وجہد کرنی پڑی۔ ڈاکٹر ہنٹر کی زہریلی کتاب کا زبردست اور مدلّل جواب جس نے ڈاکٹر صاحب کے دلائل کے پرخچے اُڑا دیئے، منجملہ اسی نوع کی کوششوں میں سے ہے۔ بائبل کی تفسیر بھی اسی غرض سے لکھنی شروع کی تھی۔ وہ صرف یہی نہیں چاہتے تھے کہ انگریزوں کے دل سے بدظنی دور ہو جائے بلکہ ان کی بڑی خواہش تھی کہ مسلمانوں کے ساتھ انصاف کیا جائے، ان کے واجب حقوق ان کو دیے جائیں اور گورنمنٹ ان کے تعلیمی اور تہذیبی امور میں جائز امداد دے اور انگریزوں اور مسلمانوں میں باہم دوستانہ تعلّقات ہوں۔ انگریزی تعلیم کی ضرورت اس وجہ سے بھی اُنھوں نے محسوس کی کیونکہ بغیر انگریزی تعلیم کے انگریزوں کے کیریکٹر، ان کی تاریخ، ان کے نظم ونسق اور اصول حکومت کا سمجھنا مشکل تھا۔

لوگوں میں یہ ایک عام خیال ہو گیا تھا کہ وہ انگریزی حکومت اور انگریزوں کے خوشامدی ہیں بعض مخالفوں نے تو انھیں ابن الوقت تک کہہ دیا جس شخص نے ان کی زندگی اور سیرت کا بغور مطالعہ کیا ہے وہ کبھی ایسا خیال نہیں کر سکتا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ عالی مرتبہ انگریزوں کو اپنے کالج میں بُلاتے، جلسوں میں مدعو کرتے، لفٹنٹ گورنر، وائسرائے اور بڑے بڑے انگریز آتے، کالج کا معائنہ

کرتے، ان کو ایڈریس دیئے جاتے، وہ جواب دیتے۔ اسی طرح ہندستانی رؤسا، عالی مقام حکام اور والیان ریاست کو بھی مدعو کیا جاتا۔ یہ ضرور ہے کہ بعض وقت وہ اپنی تقریریں ایسی باتیں کہہ جاتے جس میں خوشامد کا شائبہ پایا جاتا تھا لیکن وہ ان کا سچا دلی خیال ہوتا تھا، بناوٹ یا ریا نہ تھی۔ بالفرض اسے خوشامد پر محمول کیا جائے تو اس میں کوئی ذاتی غرض نہ تھی یہ سب کچھ محض قوم کے مفاد کی خاطر تھا جس شخص نے ایسے نازک زمانے میں جب کہ آزادی کے نام پر زبان کٹتی ہو، حاکم کی زبان ہی قانون ہو، مارشل لا کا دور دورہ ہو، مسلمان ہونا بذاتِ خود ایک جرم ہو، طرح طرح کے الزام تھوپ کر اُسے غیظ و غضب کا شکار بنایا جا رہا ہو "اسباب بغاوت" جیسی کتاب لکھی ہو جس پر تمام انگریز حکام بے حد برہم ہوئے اور انھیں باغی اور قابل دار سمجھا گیا اور پارلیمنٹ میں اس پر بحثیں ہوتیں جو شخص آگرہ کے دربار (۱۸۶۷ء) سے اس بات پر خفا ہو کر چلا آیا ہو کہ وہاں انگریزوں اور ہندستانیوں کی نشست میں امتیاز کیا گیا اور ہندوستانیوں کو انگریزوں کے مقابلے میں نیچے جگہ دی گئی جس پر بالادست حکام بہت بگڑے اور گورنمنٹ نے جواب طلب کیا۔ حالاں کہ اس دربار میں اُن کو طلائی تمغہ ملنے والا تھا جس نے باوجود شمالی مغربی حکومت کے معمولی ملازم ہونے کے لندن سے واپسی پر حاکم وقت لفٹنٹ گورنر سر ولیم میور سے ملاقات کرنا محض اس وجہ سے ناپسند کیا کہ اس نے سرسیّد کے تعلیمی پمفلٹ کے بعض اعتراضوں کی تردید اپنی ایک تقریر میں کی۔ سر ولیم نے اپنے ایک خط میں اُن سے دوستانہ شکایت کی جس نے ڈاکٹر ہنٹر کی زہریلی کتاب کا دنداں شکن جواب دیا ہو جس میں اُس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ مسلمان مذہباً انگریزی حکومت کا غیر وفادار اور باغی ہے اور انگریزی حکومت کے خلاف لڑنا اور جہاد کرنا اس کا مذہبی فرض اور یہ کہ ہندوستان کے مسلمان اب بھی گورنمنٹ انگریزی کے لئے موجب خطر

چلے آتے ہیں۔ سرسید کے اس جواب کا انگلستان کے اخباروں میں بہت چرچا ہوا۔ اور تعریفی تبصرے چھپے اور ڈاکٹر ہنٹر پر بڑی لے دے ہوئی جو سر ولیم میور کی کتاب "لائف آف محمد" پڑھ کر بے تاب ہوگیا ہو جس میں اسلام کی حقانیت اور پیغمبر اسلام صلعم کے کیرکٹر پر حملے اور اعتراض تھے۔ ہندستان میں جواب کے لئے کتابوں اور نوشتوں کا کافی سامان نہ ملنے کی وجہ سے انگلستان کا سفر اختیار کرتا ہو اور اس کی اشاعت کے ناقابل برداشت مصارف سے زیر بار ہوکر اپنا سامان اور کتب خانہ بیچنا اور کوٹھی رہن کرتا ہے اور دن رات مسلسل محنت کر کے اپنی یادگار ایک بے مثل اور محققانہ تصنیف خطبات احمدیہ چھوڑ جاتا ہے جس نے تعلیمی معاملے میں صاف یہ کہہ دیا ہو کہ "ہمیں گورنمنٹ کی پالیسی کی کچھ پروا نہیں کرنی چاہیئے۔ اگر ہم میں سیلف ریسپکٹ کا کچھ اثر باقی ہو تو گورنمنٹ کو دکھا دینا چاہئے کہ بلاشبہ گورنمنٹ کو لوگوں کی جانوں پر اختیار ہے مگر لوگوں کی رائے پر نہیں۔" جس شخص نے زمانۂ ملازمت میں کبھی اپنے بالادست انگریز حکام کی ناجائز سفارشوں یا احکام کی تعمیل نہ کی ہو اور اپنی آزادی کو قائم رکھا ہو جس شخص نے اُن تمام یورپین افسروں سے ملنا جلنا چھوڑ دیا ہو جنھوں نے مدرسۃ العلوم کی مخالفت کی تھی، یا اس کے لئے سرکاری امداد ملنے میں مزاحم ہوئے تھے جس نے ہر موقع پر جب ہندستانیوں کی سُبکی یا ذلت کی گئی ہو انگریزوں پر سخت نکتہ چینی اور اُن کی مخالفت کی ہو اس کو انگریزوں کا خوشامدی کہنا سراسر بہتان ہے۔

جب کبھی ان کو ہندستانیوں کے ساتھ بدسلوکی کا حال معلوم ہوتا تو سخت رنج ہوتا اور بہت بگڑتے تھے۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں اس قسم کے واقعات کے متعلق بے شمار آرٹیکل شائع ہوئے ہیں۔ میری موجودگی میں انھوں نے اپنا

ایک واقعہ بیان کیا کہ علی گڑھ میں ایک سشن جج آئے جن کی نسبت یہ شکایت تھی
کہ ہندستانیوں سے اچھا برتاؤ نہیں کرتے۔ سرسید اُن سے نہیں ملے۔ کچھ دنوں
بعد لفٹنٹ گورنر علی گڑھ تشریف لائے۔ سرسیّد سے ملاقات کے دوران میں باتوں
باتوں میں یہ کہا کہ اب تک آپ سشن جج صاحب سے نہیں ملے۔ سرسیّد نے کہا کہ
اوّل تو اُن کو اپنے آداب کے مطابق مجھ سے ملنے آنا چاہئے تھا۔ خیر یہ بھی نہ سہی
اصل بات یہ ہے کہ وہ ہندستانیوں سے اچھا برتاؤ نہیں کرتے اس لئے میں
نے اُن سے ملنا پسند نہیں کیا۔ چند روز کے بعد سیشن جج صاحب خود ملنے آئے۔
ایسے ہی علی گڑھ میں مسٹر واٹسن کلکٹر ہو کر آئے جو کسی ہندستانی کو جوتا اتارے بغیر
بچے کمرے میں نہیں آنے دیتے تھے۔ سرسیّد اُن سے نہیں ملے۔

قومی لباس کا اُنھیں بہت خیال تھا۔ ہندستان میں مختلف مقامات میں مختلف
لباس تھے۔ اُن میں سے کسی میں کوئی خصوصیت نہیں پائی جاتی تھی۔ قومی لباس
کا ایک ہونا قومی یگانگت اور اتحاد کے لئے ایسا ہی ضروری ہے جیسے زبان اور
مذہب کا ایک ہونا۔ چناں چہ اس بنا پر جیسا کہ اُنھوں نے ایک جگہ لکھا ہے
سرسیّد نے ترکی لباس اختیار کیا جو کہ اُس وقت ملتِ اسلامیہ کی معززترین
جماعت اور اسلام کے سب سے عظیم الشان فرماں روا کا لباس تھا۔ بعض تنگ
دل اور متعصّب انگریز اس لباس کو دیکھ کر بہت ناک بھوں چڑھاتے تھے۔ اسی
طرح جب کوئی ہندوستانی انگریزی لباس میں ہوتا تو ناراضی کا اظہار کرتے۔ سرسیّد
اس معاملے میں بہت سخت تھے۔ چنانچہ جب لارڈ ڈفرن نے ایک موقع پر اپنی
تقریر میں اس قسم کے تبدیل لباس کے متعلق اپنی ناپسندیدگی کا خیال ظاہر
کیا تو سرسیّد نے اس کے جواب میں نہایت سخت آرٹیکل لکھا۔ اس معاملے میں
ایک واقعہ خاص میری ذات سے تعلق رکھتا ہے۔ میں بیان نہ کرتا، لیکن چوں کہ

اس سے سرسیّد کے خیال کی اصلی حقیقت ظاہر ہوتی ہے اس لئے مجھے بیان کرنا پڑا۔

سیّد صاحب کو بہت دنوں سے یہ دُھن تھی کہ کالج میں قومی لباس (جو اُنھوں نے اپنے لئے بھی تجویز کیا تھا) رائج کیا جائے چناں چہ اس خیال سے فرمایش کرکے کانپور کے کسی کارخانے سے ایک نیلگوں سیاہ ریلو بلیک (سرج) کا ایک تھان تیار کرایا، جب یہ کپڑا آیا تو اس میں سے ایک ترکش کوٹ اپنے لئے ایک میرے لئے اور ایک سرسیّد راس مسعود کے لئے جو اس وقت بچّہ تھے سلوایا سیّد محمود نے شکایت کی ہمارے لئے نہیں۔ کہا اس تھان میں اتنی گنجایش نہیں تھی اس سے پہلے وہ دلّی سے سیاہ کپڑے کے ٹکڑوں پر کلابتوں سے "مدرستہ العلوم" کڑھوا لائے تھے۔ کالر پر "مدرستہ" ایک طرف اور "العلوم" دوسری طرف ٹکا ہوا تھا جب کالر کا ہُک لگاتے تو سامنے پورا دارالعلوم آجاتا جس وقت درزی میرا کوٹ سی کر لایا تو میں اُس وقت سیّد محمود کے پاس دوسرے کمرے میں بیٹھا تھا مجھے بلایا۔ درزی نے مجھے کوٹ پہنایا۔ وہ پہنا ہی چکا تھا کہ جھٹ سیّد صاحب کرسی سے اُٹھے اور مجھے سلام کیا اور کہا "تم بیری ہو" بجائے اس کے کہ میں سلام کرتا اُنھوں نے مجھے سلام کرنے میں تقدیم کی۔ اس سے مجھ پر اس قدر شرم غالب ہوئی کہ ایک لفظ نہ کہہ سکا۔

چند روز کے بعد فرمایا کہ طالب علموں سے نام بنام دریافت کرو کہ وہ اس لباس کو پسند کرتے ہیں یا نہیں۔ میں نے بھی ایک ایک سے پوچھا اور پوری فہرست بنا ڈالی سب نے اسے پسند کیا۔ صرف دو چار ایسے تھے جنھوں نے کہا ہمیں اس سے اختلاف تو نہیں البتہ کوٹ کی جگہ شیروانی ہوتی تو اچھا تھا۔ ایک روز حسب معمول سیّد صاحب شام کو کالج تشریف لائے۔ اتفاق سے میں بھی

اُدھر ہی جا رہا تھا۔ گاڑی میرے پاس سے گزری تو ٹھیرالی اور پوچھا کیا ہوا۔ میں نے کہا سب طالب علم اس لباس کو پسند کرتے ہیں۔ صرف دو چار ایسے ہیں جنھیں اختلاف تو نہیں لیکن یہ کہتے ہیں اگر کوٹ کی جگہ شیروانی ہوتی تو اچھا تھا۔ اس پر بہت خفا ہوئے اور کہنے لگے اُن کو نکال دو۔ اُن کی یہ خفگی بچوں کی سی تھی، دو چار منٹ رہی اور پھر کچھ نہیں۔ کچھ دنوں کے بعد لفٹننٹ گورنر کالج میں تشریف لائے۔ اِسٹریچی ہال میں بڑا جلسہ ہوا۔ لفٹننٹ گورنر کے ہاتھ سے انعامات تقسیم کرائے گئے۔ جو لڑکے یہ لباس پہنے ہوئے تھے اُنھیں سید صاحب نے اگلی صف میں خاص جگہ بٹھایا۔ جب انعام وغیرہ تقسیم ہو چکے اور گورنر رخصت ہونے لگے تو وہ اُن کو ہمارے پاس لائے اور خوشی خوشی یہ لباس دکھایا۔ گورنر نے بھی بہ ظاہر خوشنودی کا اظہار کیا۔ وہ جب کسی طالب علم کو اس لباس میں دیکھتے تو باغ باغ ہو جاتے۔ یہ کارروائی اُس زمانے میں عمل میں آئی جب ہمارے ہر دل عزیز پرنسپل مسٹر بیک رخصت پر انگلستان تشریف لے گئے تھے۔ واپس آئے اور یہ رنگ دیکھا تو زبان سے تو کچھ نہ کہا اور نہ کہتے کیا لیکن قرائن سے معلوم ہوا کہ دل ہی دل میں بہت گھٹے۔ آدمی ہوشیار تھے خاموش رہے۔ یہ ۱۸۹۳ء کا واقعہ ہے۔

اسی سال کالج کی جماعتوں میں فوجی ڈرل جاری کی گئی۔ اس سے صرف سال چہارم یعنی بی۔ اے کی آخری جماعت مستثنیٰ تھی۔ ایک دن پرنسپل مسٹر بیک جن کی تحریک سے ڈرل کا نیا نیا انتظام جاری ہوا تھا، ہماری جماعت میں آئے۔ اُن کے ہاتھ میں رنگین ریشمی ململوں کے کئی نمونے تھے۔ فرمانے لگے کہ تم اپنی جماعت کے لئے ان میں سے کون سا رنگ پسند کرتے ہو۔ میں نے کہا کہ ڈرل کے لئے اس قماش کے کپڑے کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتے فرمایا

سوال رنگ کا ہو کپڑے کا نہیں۔ غرض ہر جماعت کے لئے الگ الگ رنگ کی
ریشمی ململوں کی شیروانیاں اور پگڑیاں تجویز ہوئیں اور اسی وردی میں طالب علم
ڈرل کرتے تھے۔ دنیا کے شاید ہی کسی ملک میں پریڈ کے لئے ایسا نازک اور ملائم
لباس ہو۔ لڑکے تو لڑکے لڑکیوں کی ڈرل کے لئے بھی کوئی ایسا لباس تجویز نہ کرتا
ان نوجوان طالب علموں کو جو قومی بہبودی اور ترقی کے لئے جد و جہد کرنے کو
تیار کئے جا رہے تھے اور جن سے قوم کی خاطر زندگی کے میدان کارزار میں
محنت و مشقت ایثار و جاں نثاری کی توقع تھی اس قسم کے لباس میں ڈرل اور پریڈ
کرانا جو کسی رئیس کے لئے زیادہ موزوں تھا کس قدر نامناسب اور مضحکہ خیز تھا
میں جب طالب علموں کو اس میں ڈرل کرتے دیکھتا تو مجھے بہت کوفت
ہوتی تھی۔ بہت سوچ بچار کے بعد میرے خیال میں یہ بات آئی کہ یہ معاملہ کسی
طرح سید صاحب تک پہنچانا چاہئیے۔ اس کے متعلق میں نے مولوی حمید الدین
مرحوم سے بھی جو میرے ہم جماعت تھے مشورہ کیا۔ انھوں نے میری رائے سے
اتفاق کیا۔ معاملہ بہت نازک تھا۔ اس میں درپردہ مسٹر بیک کی شکایت نکلتی
تھی مسٹر بیک بڑے جابر اور خود رائے تھے اس زمانے میں ان کا اثر اور
اقتدار اتنا بڑھ گیا تھا کہ میں تو خیر ایک طالب علم تھا کسی بڑے سے بڑے
ٹرسٹی حتیٰ کہ نواب محسن الملک تک کی یہ مجال نہ تھی کہ ان کے خلاف سید صاحب سے
کچھ کہہ سکیں۔ آخر ایک روز دل کڑا کر کے اس مہم کے سر کرنے پر آمادہ ہو گیا مولوی
حمید الدین کو بھی ساتھ لیا۔ یہ جمعہ کا دن تھا۔ جمعہ کو آدھے دن کی چھٹی ہوتی
تھی ہم کالج سے سیدھے سید صاحب کی کوٹھی پر پہنچے۔ سید صاحب حسب معمول
کام کر رہے تھے۔ ہم سلام کر کے سامنے بیٹھ گئے۔ سید صاحب برابر لکھتے رہے اور
ہم خاموش بُت بنے بیٹھے رہے۔ میرا دل دھکڑ پکڑ کر رہا تھا اور اس سوچ میں

تھا کہ اس ناگوار ذکر کو کس طرح چھیڑوں۔ اتنے میں ملازم نے کھانا چننا شروع کیا
کھانے کی میز اسی حال میں تھی۔ جب کھانا آگیا تو سید صاحب اٹھ کر کھانے کی
میز پر جا بیٹھے۔ دوسری طرف سے سید محمود بھی آپہنچے، علیک سلیک کے بعد
انھوں نے کھانے کی صلاح کی۔ میں نے کہا ہم کھانا کھا چکے ہیں۔ کہنے لگے خیر
یہاں آکر بیٹھ تو جاؤ۔ میں سید محمود کے پاس جا بیٹھا۔ زبان یاری نہیں دیتی
تھی کہ کہوں تو کیا کہوں اور کیوں کر کہوں حسن اتفاق کہ خود سید صاحب ہی نے
جنھیں ان دنوں قومی لباس کی دھن سمائی ہوئی تھی، اپنے تجویز کیے ہوئے
لباس کا ذکر چھیڑا، میں نے کہا، اب تو دوسرا ہی لباس شروع ہو گیا ہے۔ پوچھا وہ کیا؟
میں نے عرض کیا جب سے ڈرل شروع ہوئی ہے تو اس کے لئے نیا لباس تجویز
کیا گیا ہے۔ کہنے لگے وہ صرف ڈرل کے لئے ہے، اس سے ہمارے لباس کو کیا تعلق
میں نے کہا ڈرل کے لئے رنگین ریشمی اچکنیں اور ریشمی ململوں کی پگڑیاں تجویز
کی گئی ہیں۔ کہنے لگے، ہاں میں نے بھی دیکھا زین العابدین کا لونڈا ابرساتی ٹڈا بنا
پھرتا ہے۔ سید محمود نے فرمایا کہ ڈرل پریڈ انگریزوں کی چیز ہے اس لئے ہم نے
یہ کام انگریز پروفیسروں کے سپرد کر دیا ہے۔ فرض کرو میں ایک کلب بناتا ہوں
اور اس کی ممبری کے لئے یہ شرط لگاتا ہوں کہ ہر ممبر دم لگا کر آئے۔ اب ہر ممبر کو
اس کی پابندی کرنی ہوگی۔ جسے یہ شرط پسند نہ ہو وہ ممبر نہ بنے۔ میں نے کہا کہ اگر
آپ سب کے لئے یہ شرط لازم کر دیں تو پھر۔ کہنے لگے کہ سوا تعلیم کے کوئی
دوسری چیز لازم نہیں ہوسکتی اور کسی کو جبر کرنے کا حق نہیں۔ سید صاحب نے فرمایا
کہ محض اس وجہ سے ایک شخص ورزش یا کسی اور تحریک سے محروم کر دیا جائے، یہ
نہیں ہوسکتا۔ میں نے کہا بات یہیں تک رہتی تو مضائقہ نہ تھا لیکن بات بہت آگے
بڑھ گئی ہے۔ ڈرل تعلیم کے درمیانی گھنٹوں میں ہوتی ہے کسی جماعت کی دوسرے

گھنٹے کے بعد کسی کی تیسرے گھنٹے کے بعد، تو اب لڑکے پوٹلیاں باندھ باندھ کر لاتے ہیں تو یہ ہے کہ تعلیم کا گھنٹہ ختم ہوتے ہی ایک لباس بدلیں اور دوسرا پہنیں۔ اس کے لئے اتنی مہلت اور نہ اس کا موقع۔ لامحالہ ڈرل ہی کا نفیس رنگین لباس پہن کر کالج کی جماعتوں میں آتے ہیں اور گھنٹہ ختم ہوتے ہی ڈرل میں جا شریک ہوتے ہیں یہ سنتے ہی سید صاحب جلال میں آ گئے کانٹا ایک طرف اور چھری دوسری طرف جا پڑی۔ فرمانے لگے اس میں ایک پیچ ہے وہ میری عمر بھر کی محنت خاک میں ملانا چاہتا ہے میں ملکہ معظمہ کی لیوی میں بھی اسی لباس میں گیا اور کوئی تبدیلی منظور نہ کی سید محمود نے کہا ہر شخص تو آپ سا نہیں ہو سکتا۔ پھر سید محمود کی طرف مخاطب ہو کر کہا آج کالج میں میرا لکچر ہے تم بھی آنا۔ اور مجھ سے فرمایا کہ اب تم جاؤ ہم اٹھ کر چلے آئے۔ رستے بھر بہت پریشان رہا اور دل ہی دل میں ڈر رہا تھا کہ کہنے کو تو میں سب کچھ کہہ گیا، لیکن سید صاحب نے مسٹر بیک سے اس کا ذکر کر دیا تو میری خیر نہیں۔

سید صاحب نے کالج کے لئے آنریری لکچروں کی تجویز کی تھی اور پہلا لکچر اُنھوں نے خود دینا منظور کیا تھا۔ اوپر کی گفتگو میں اسی لکچر کی طرف اشارہ تھا غرض نماز جمعہ کے بعد سید صاحب تشریف لائے۔ اسٹریچی ہال طالب علموں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ بڑے دروازے کے مقابل ہال کے آخر میں ایک تخت بچھا ہوا تھا اور اس پر ایک میز اور ایک کرسی رکھی ہوئی تھی۔ سید صاحب ہال میں اس طرح داخل ہوتے جیسے کوئی جہاز آتا ہے۔ تخت پر چڑھ کر کھڑے ہو گئے اور حاضرین پر ایک نظر ڈالی اور کہا کہ ایک کرسی اور لاؤ۔ چناں چہ ایک اور کرسی تخت پر لا کر رکھ دی گئی۔ اس کے بعد فرمایا کہ مسٹر بیک کہاں ہیں کسی نے کہا یہ ہیں۔ وہ اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ سید صاحب نے دوسری کرسی کی طرف اشارہ

کیا کہ یہاں آکر بیٹھو۔ یہ سُن کر میرا ماتھا ٹھنکا اور سمجھا کہ اب ضرور کوئی آفت آنے والی ہے۔ جب مسٹر بیک بیٹھ گئے تو اُنھوں نے اپنی تقریر یوں شروع کی:۔

"اے عزیز طالب علمو! مجھ کو اور تم کو اور تمہارے اُستادوں، تمھارے ماں باپ، تمھاری قوم کو اس بات سے نہایت خوشی ہوگی کہ تم دور دراز فاصلے اور مختلف شہروں بلکہ مختلف ملکوں سے اس جگہ تحصیل علوم کے لئے جمع ہو، مختلف علوم پڑھتے ہو اور مختلف مصنّفوں کے عمدہ خیالات، عمدہ مسائل علمی، عمدہ معقولات اخلاق سے لُطف اُٹھاتے ہو۔ تمھارے اُستاد ۔۔۔۔۔۔ گو وہ تم کو عمدہ عمدہ کتابوں سے جو بڑے بڑے عالموں اور مصنّفوں نے تصنیف کی ہیں سبق دیتے ہیں، مگر آج میں تم کو ایسی کتاب سے سبق دینا چاہتا ہوں جو نہ کاغذ پر لکھی ہوئی ہے نہ کسی پریس کی چھپی ہوئی ہے نہ کسی مصنّف کی بنائی ہوئی ہے بلکہ قدرت نے اپنے کامل اور فیاض ہاتوں سے اُس کو بنایا ہے۔ اُس کے حروف بہت پُرکار اور مجسّم ہیں مگر اُن کا دیکھنا اور پڑھنا کسی قدر مشکل ہے۔ اُس کے معانی بھی بہت آشکارا ہیں مگر اُن کا سمجھنا کچھ آسان نہیں۔ اُس کے پڑھنے کے لئے، اُس کے کھولنے کی ضرورت نہیں۔ وہ تمھاری آنکھ کے سامنے ہر وقت کھلی رہتی ہے۔ اس کتاب کو تم اپنے کالج کی لائبریری یا اپنی میز کی کتابوں میں مت ڈھونڈو۔ وہ ہر وقت تمھارے پاس موجود ہے۔ وہ کتاب کیا ہے؟ خود تمھارا اور تمھارے ساتھیوں کا اس کالج میں ایک جگہ جمع ہونا ہے پس تم کو سمجھنا چاہئے کہ اس کتاب کو کیوں کر پڑھو اور اس کے معنی کیوں کر سمجھو۔

"اے عزیزو اس کتاب کا نام ہے "کالج لائف یا نئی زندگی" یہی اصلی کتاب ہے اور اس کا پڑھنا اور اسی کا سمجھنا اصلی فائدہ اور اصلی مقصود زندگی کا

اور اس کالج کا ہے۔ اس کتاب کو اگر تم نے اچھی طرح پڑھا اور اچھی طرح رکھا اور داغ دار نہ کیا تو تمھاری آئندہ زندگی وہ زندگی ہوگی جس کیلئے انسان کو زندہ رہنا چاہئے۔ ورنہ اُس کی زندگی اور موت دونوں برابر ہیں بلکہ موت زندگی سے بہتر ہے۔"

اس کے بعد اُنھوں نے زندگی کے مختلف زمانوں پر تبصرہ کیا کہ بچپن میں تمھاری کیا حالت تھی اور ماؤں نے کس طرح شفقت اور محبّت سے پرورش کی۔ یہ زمانہ بھی گزر گیا اور دوسرا زمانہ آیا جس میں تم چلنے پھرنے اور کھانے پینے لگے۔ یہ بھی گزر گیا اور تم ایک نئی زندگی میں آئے جس میں تعلیم ہوئی اور مذہبی باتیں سکھائی گئیں۔

" یہ زمانہ بھی چند سال میں گزر گیا اور تم ایک نئی زندگی میں آئے جو خطرات سے خالی نہ تھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کیوں کہ تم ہی میں بہت سے دشمن تمھارے پیدا ہو گئے تھے اور ہر وقت تمھاری گھات میں لگے رہتے تھے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تمھارے ماں باپ نے جہاں تک اُن سے ہو سکا تم کو ان دشمنوں سے بچایا۔ کوئی بچ گیا۔ کوئی کسی قدر بچا اور کسی قدر دشمنوں کے پنجے میں پھنسا رہا۔ اور کوئی دشمنوں کے جال میں ایسا پھنسا کہ اس سے نکلنا ناممکن ہوا۔ مگر جو بچے یا کسی قدر بچے دشمنوں نے ان کا بھی ساتھ نہ چھوڑا اور گھات میں لگے رہنے سے غافل نہیں ہوئے۔ تم ان کو نہیں دیکھتے تھے اور وہ تمھارے ساتھ ساتھ رہتے تھے اور کبھی اپنی صورت اس طرح سے تم کو دکھاتے تھے کہ تم اُن کو اپنا دوست سمجھتے تھے حالاں کہ وہ تمھارے دشمن تھے۔

یہ زمانہ بھی تمھاری زندگی کا گزر گیا مگر اس درمیان میں تم اپنے دشمنوں سے واقف ہو گئے اور اُن سے پناہ میں رہنے کے لئے تم نے ایک نہایت

زبردست اور عاقل ماں کی تلاش کی ۔۔۔۔۔ اور ایک نئی زندگی میں داخل ہوئے اور سمجھے تمھاری وہ عاقل ماں ہے کون؟ یہ کالج ہے جس میں تم داخل ہوئے اور اب تم سب اس کے بچے ہو۔

تم سمجھے کہ وہ تمھاری نئی زندگی کیا ہے؟ وہ کالج لائف ہے۔ اگر تم نے اس کو اچھی طرح گزارا تو تمھارا بیڑا پار ہے ورنہ منجدھار میں ڈوبنا ہے جس کے بعد پھر اُبھرنا اور تیرنا نہیں، اب تم کو اختیار ہے چاہو اپنا بیڑا پار لگاؤ، چاہو منجدھار میں ڈبو دو۔

اب مجھ کو یہ بتانا ہے کہ تم کو کالج لائف سے کیوں کر فائدہ اُٹھانا چاہیئے۔ سب سے اوّل اور تمام برکتوں کی جڑ تمھارا آپس میں سلوک اور محبّت سے رہنا ہے تمام طالب علم ہندستان کے ہوں یا پنجاب کے، پورب کے ہوں یا پچھم کے اُتّر کے ہوں یا دکھّن کے جب وہ سب تمھاری اُس عاقل ماں کی گود میں پڑے ہیں تو وہ سب تمھارے بھائی ہیں۔ اگر تم نے اُن کے ساتھ مثل بھائی بھائی کے برتاؤ نہ کیا اور برادرانہ محبّت ایک دوسرے کے ساتھ نہ برتی تو تم نے اُس پہلے اُصول کو کہ تم سب ایک عاقل ماں کے بچّے ہو توڑ دیا۔ اور جس طرح ایمان کے لئے کلمۂ توحید پہلا رُکن ایمان کا ہے۔ اسی طرح وحدت کا پہلا رُکن بورڈنگ ہوس کی فائدہ مندی کے لئے ہے اور جس طرح ایمان کا پہلا رکن توڑنے سے آدمی ایمان کے لائق نہیں رہتا۔ اس لئے تم کو لازم ہے کہ مثل ماں جائے بھائیوں کے آپس میں محبت اور دوستی برتو۔"

اس ضمن میں بورڈنگ ہوس میں ایک جگہ رہنے سہنے، کھانے پینے، ملنے جلنے، مِل کر کھیلنے، ادبی تحریکوں میں شریک رہنے کے اثرات کا ذکر کیا۔

اس کے بعد فرمایا کہ "تمام چیزیں جو دنیا میں عقلی و ذہنی ہیں اُن کا کچھ نہ کچھ نشان ظاہر میں بھی پایا جاتا ہے۔ تم جانتے ہو کہ اُس برادری اور دلی محبت اور

دوستی کی جو تم آپس میں اپنی عاقل ماں کے بچے ہونے میں رکھتے ہو ظاہری نشانی کیا ہے؟ یہ نشان کسی انسان کا بنایا ہوا نہیں ہے۔ خدا کا بنایا ہوا ہے جس کے پورا نہ کرنے سے تم صرف دنیا ہی میں ملامت کے قابل نہیں ہوتے بلکہ خدا کی ناراضی کے بھی مستحق ہوتے ہو وہ نشان کیا ہے؟ جماعت کی نماز ہی جو خدا نے جیسا کہ وہ واحد ہے تمھاری آپس کی وحدت کے لئے مقرر کیا ہے۔" پھر نماز سے جو عملی طور پر یگانگت پیدا ہوتی ہے اُس کی توضیح کی۔

اس کے بعد فرمایا کہ "ایک اور چیز اُس وحدت اور آپس میں یگانگت پیدا کرنے کی ہے۔ وہ کیا ہے؟ تم سب بورڈوں کا اور خصوصاً کالج کلاس کے طالب علموں کا ایک سا لباس کا ہونا۔ شاید کچھ لوگ ایسے بھی ہوں جو اس کو تسلیم نہ کرتے ہوں اور کہتے ہوں کہ ظاہری چیزوں کو اندرونی جذبات کی اصلاح سے کیا تعلق ہے مگر یہ محض غلطی ہے۔ مذہب کی رو سے، دنیا کے برتاؤ سے بہت سی ظاہری چیزیں ایسی ہیں جو اندرونی جذبات پر اثر کرتی ہیں۔" اس سلسلے میں انھوں نے مختلف جماعتوں اور فرقوں کی مثالیں دیں کہ لباس کی یکسانی سے ان میں کیسی ہمدردی اور یک جہتی اور محبت ہوتی ہے۔

اس کے بعد فرمایا کہ "جو لباس اب تمھارا ہے یعنی ترکی ٹوپی اور کوٹ اور انگلش بوٹ یہ نہایت عمدہ ہے، یہی لباس سلطان روم اور اُن کے امرا اور نوکر چاکروں کا ہے۔ اسی کو ہم نے اختیار کیا ہے۔"

اس کی تصریح کرنے کے بعد فرمایا "ہندوستان میں بعض کوتاہ نظر یا مغرور اور کم ہیں انگریز جو ہندوستانیوں کو ذلیل رکھنا چاہتے ہیں یا ذلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں ایسی ٹوپی، کوٹ اور بوٹ پہنے ہوئے ہونے پر اعتراض کرتے ہیں۔"

اس آخری فقرے پر اس زور سے چیرز ہوئیں کہ سارا ہال گونج اٹھا مسٹر بیک

کا رنگ فق ہوگیا اور منہ پر ہوائیاں چھوٹنے لگیں۔ اس ہال میں بیسیوں کیا سینکڑوں جلسے ہوئے ہیں اور بعض بڑے اہتمام اور شان وشوکت سے ہوئے لیکن کسی جلسے میں اس جوش وخروش اور زور سے تالیاں نہیں بجائی گئیں جیسے اس موقع پر۔ اس کے بعد یہ فرمایا کہ "جو انگریز ان باتوں میں تکرار کرتے ہیں میرے یقین میں وہ اس امر کے ماسٹر ہیں کہ کبھی ہندستانیوں اور انگریزوں میں دوستی ومحبت اور اخلاص کا برتاؤ نہ ہو۔ باوجود ان کوششوں کے جو میں نے مسلمانو اور انگریزوں میں اتحاد اور دوستی پیدا کرنے کی کی ہیں ایسے انگریز سے جو ان باتوں میں کاوش کرتا ہو میں خود کبھی اس سے نہیں ملتا اور دوستی کرنا نہیں چاہتا" اس کے بعد انھوں نے سلسلۂ کلام دیر تک جاری رکھا۔ جلسہ برخاست ہونے پر طالب علم اپنے اپنے کمروں میں گئے رنگین ریشمی ململ کی پگڑیاں نکالیں انھیں پھاڑ پھاڑ کر کسی نے قمیصیں بنائیں اور کسی نے کمرے کے پردے۔ اس طرح یہ قضیۂ نا مرضیہ ختم ہوگیا۔

جسٹس سید محمود کا چیف جسٹس الہ آباد سے کسی معاملے میں جھگڑا ہوگیا تھا۔ چیف جسٹس نے ان کی شکایت گورمنٹ کو لکھ بھیجی۔ سید محمود نے اس کا جواب لکھا جو کئی سو صفحوں پر تھا۔ لیکن اسی اثنا میں انھوں نے ملازمت سے استعفا دیدیا۔ سید صاحب اس معاملے کے متعلق کچھ کہنا یا لکھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ لیکن جب اُن کے احباب اور دوسرے لوگوں نے بہت تقاضا کیا تو انھوں نے مجبوراً ایک مضمون اپنے اخبار علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع کیا۔ جس میں سید محمود کی سیرت کی بہت ہی دلچسپ تصویر کھینچی ہے۔ اور آخر میں لکھا ہے کہ انگریز کے دماغ میں اب تک فاتح ہونے کا غرور سمایا ہوا ہے۔ اور اسے کسی طرح یہ گوارا نہیں کہ گورا اور کالا ایک بنچ پر ساتھ ساتھ بیٹھیں۔ اس مضمون کا بڑا

چرچا ہوا اور کانگریسی اخباروں نے اُسے خوب اُچھالا۔

اس میں شک نہیں کہ وہ انگریزی حکومت کو ہندوستان اور خاص کر مسلمانوں کے حق میں موجب برکت سمجھتے تھے۔ چناں چہ انھوں نے اس خیال کا اظہار صاف صاف ان الفاظ میں کیا ہے "میں ہندستان میں انگلش گورمنٹ کا استحکام کچھ انگریزوں کی محبت اور ان کی ہوا خواہی کی نظر سے نہیں چاہتا بلکہ صرف اس لئے چاہتا ہوں کہ ہندُستان کے مسلمانوں کی خیر اس کے استحکام میں سمجھتا ہوں اور میرے نزدیک اگر وہ اپنی حالت سے نکل سکتے ہیں تو انگلش گورمنٹ کی بدولت نکل سکتے ہیں" جسٹس رانا ڈے نے بھی ہندُستان میں انگریزی حکومت کو مصلحت خداوندی اور برکت سے تعبیر کیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی سرسیّد نے یہ بھی صاف صاف کہا ہے کہ انگریزوں سے ہمیں جو توقع تھی وہ پوری نہ ہوئی ۱۸۸۴ء میں علی گڑھ میں ڈنر پر مسٹر بلنٹ کا جام صحت تجویز کرتے وقت انھوں نے فرمایا "اگر ہماری کسی آرزو سے وہ (مسٹر بلنٹ) واقف ہوئے ہوں گے تو وہ صرف انگریزوں کی طرف سے سمپیتھی کی خواہش ہوگی جس کی نسبت بلاشبہ میں کہوں گا کہ ہماری وہ خواہش پورے طور پر پوری نہیں ہوئی"۔ اسی تقریر میں یہ بھی کہا "وہ زمانہ جس میں انگریزی حکومت قائم ہوتی ایسا زمانہ تھا کہ بچاری انڈیا بیوہ ہو چکی تھی۔ اس کو ایک شوہر کی ضرورت تھی۔ اس نے خود انگلش نیشن کو اپنا شوہر بنانا پسند کیا تاکہ کاسپل کے عہدنامے کے مطابق وہ دونوں مل کر ایک تن ہوں۔ مگر اس وقت پر اس پر کچھ کہنا ضرور نہیں کہ انگلش نیشن نے اس پاک وعدے کو کہاں تک پورا کیا"۔

سرسیّد نے انگریزوں کی بدگمانی جو انھیں مسلمانوں سے تھی اور مسلمانوں کی نفرت جو ان کو انگریزوں سے تھی، رفع کرنے میں طرح طرح کے جتن کئے۔ مغربی تعلیم اس غرض کی اصل بنیاد تھی۔ اس کے علاوہ انھوں نے امور معاشرت میں

بھی اسی جرأت سے کام لیا جیسے تعلیم اور مذہب کے معاملے میں مسلمان انگریز اور اس کے کھانے کو نجس سمجھتے تھے اور اس کے ساتھ بیٹھ کر ایک میز پر کھانا کھانے کو بمنزلہ ترک اسلام کے خیال کرتے تھے۔ سرسید نے اس قسم کے توہمات اور تعصبات کا بڑی سختی سے مقابلہ کیا جواز طعام اہل کتاب پر رسالہ لکھا اور خود اس بدعت کے مرتکب ہوئے۔ اس پر بڑی لے دے ہوئی اور بڑا شور غل مچا۔ وہ حق پر تھے اور دھن کے پکے تھے۔ آخر غالب آئے۔ یہ ہندوؤں کی چھوت چھات کا اثر تھا۔ اس کفر کو سید احمد خاں نے توڑا اور ایک دن وہ آیا کہ وہی لوگ جو اس فعل پر طعن تشنیع کرتے تھے انگریزوں کو دعوتیں دے دے کر ان کے ساتھ بیٹھ کر شوق سے کھانے لگے۔

سرسید کی غرض یہ تھی کہ باہم میل جول اور ربط ضبط بڑھے۔ باہمی نفرت اور بدگمانی رفع ہو اور ایک دوسرے کے خیالات سے واقف ہوں۔ اُن کا منشا یہ تھا کہ ہمارا تعلق انگریزوں سے حاکم محکومانہ نہیں دوستانہ ہونا چاہیئے۔ اسی خیال سے انھوں نے لباس میں بھی تبدیلی کی اور انگریزی طرز معاشرت بھی اختیار کی۔ جہاں تک میں نے انھیں دیکھا ہے ان میں انگریزی طرز معاشرت معمولی تھی کھانا وہ بے شک میز پر کھاتے تھے اور حسب ضرورت چھری کانٹا بھی استعمال کرتے تھے لیکن کھانا اُن کا ہندستانی ہوتا تھا۔ وہی کھانا جو عموماً مسلمان شرفا کے ہاں کھایا جاتا ہے۔ گھر میں وہ کرتہ پاجامہ (غرارہ) پہنے کام کرتے رہتے تھے کالج میں جب کبھی تعمیر کا کام دیکھنے آتے تو ایک عباسی اوڑھ پہن لیتے تھے۔ البتہ جلسوں میں پتلون، ترکی کوٹ اور ترکی ٹوپی پہن کر آتے تھے۔ کوٹھی بھی اُن کی فرش فرنیچر سے کوئی زیادہ آراستہ نہ تھی۔ مگر اُن کے بعض پیروؤں نے اس معاملے میں بڑا غلو کیا۔ اس میں پیش پیش نواب محسن الملک تھے جیدرآباد

ہیں کوئی ان کا ٹھاٹھ دیکھتا فرنیچر انگلستان سے لائے تو اس کے رکھ رکھاؤ اور صفائی کے لئے ایک انگریز بھی لیتے آئے۔ حیدرآباد سے آنے کے بعد یہ شوق دھیما پڑ گیا تھا۔ لیکن بہت سے سولین اور بیرسٹر وغیرہ اپنی طرز معاشرت میں صاحب بہادر تھے۔ انگریزی تعلیم اور انگریزی طرز معاشرت کی وجہ سے ہماری قوم میں ایک نیا طبقہ بن گیا تھا۔ "جیسے وہ نقالوں کا طائفہ" کہنا زیادہ نامناسب نہ ہوگا۔ ان میں نقل ہی نقل تھی۔ ان حضرات کو عام مسلمانوں سے بلکہ متوسط الحال شرفا سے بھی کوئی ربط اور انس نہیں رہا تھا۔

عجیب بات یہ ہو کہ اس عہد کے مسلمانوں میں اصلاح کے جتنے مدعی پیدا ہوئے انہوں نے یہی کیا۔ مصطفےٰ کمال پاشا اتاترک نے تو انتہا کردی۔ مغرب کی تقلید میں رہنا سہنا، کھانا پینا، لباس، ناچ رنگ، شراب خوری اور دوسری خرافات کو اپنا شعار بنا لیا۔ یہاں تک کہ مدارس سے مذہبی تعلیم خارج کر دی، اور اپنی زبان کا قدیم رسم الخط بھی بدل کر رومن کر دیا۔ ترکی اخبار نویسوں کا جو وفد دلّی آیا تھا وہ بار بار بڑے تفخر سے اپنے آپ کو یورپین نیشن کہتا تھا۔ دلّی کے مسلمانوں کی خواہش تھی کہ جمعہ کے روز جامع مسجد میں تشریف لائیں لیکن انہوں نے یہ درخواست قبول نہ فرمائی۔ خاص کوشش سے اُن کے پروگرام میں مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کا معائنہ بھی رکھا گیا تھا مگر وہاں تشریف نہیں لے گئے اور ہندو یونی ورسٹی بنارس کو (جو اُن کے پروگرام میں نہ تھی) اپنے قدوم سے مشرف فرمایا۔ امان اللہ خاں کو اصلاح کی سوجھی تو اُس نے بھی اصلاح لباس ہی سے شروع کی۔ لوگوں کو اور خاص کر مولویوں کو جبراً کوٹ، پتلون اور ہیٹ پہننے کا حکم دیا۔ حکم کی خلاف ورزی پر سزا دی جاتی تھی۔ رضا شاہ پہلوی شاہ ایران ان سے بھی دو قدم آگے بڑھ گئے۔ انہوں

نے لباس کے بارے میں اسی قسم کی سختیاں کیں اور پردے کی مخالفت ہی نہیں
کی بلکہ بے پردگی کو جبراً رائج کیا۔ مشہد کے علمانے اس سے اختلاف کیا تو
وہاں کے مینار پر مشین گنیں چڑھا دی گئیں اور صرف چند گھنٹوں کی مہلت
دی کہ اگر اتنے عرصے میں حکم کی تعمیل نہ کی تو شہر کو اڑا دیا جائے گا۔ مجبور ہو کر
سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ اس کے بعد گورنر نے ایک بڑا جلسہ برپا کیا اور تمام حکام
اور شرفا کو حکم دیا کہ وہ اپنی بیویوں سمیت حاضر ہوں۔ ایک صاحب تنہا آئے
کیوں کہ اُن کی بیوی نے بھرے جلسے میں بے پردہ جانا گوارا نہ کیا۔ اُنھیں
حکم دیا گیا کہ جاؤ بیوی کو ساتھ لے کر آؤ۔ وہ گئے اور اُس نیک بخت کو ساتھ
لے کر آئے۔ اس کی یہ سزا تجویز کی گئی کہ وہ تمام حاضرین جلسہ سے فرداً فرداً
ہاتھ ملائے۔ اور تو اور مولانا عبیداللہ سندھی جیسے فاضل عالم دین نے
مولویوں کو للکارا کہ کوٹ پتلون پہنو اور داڑھیاں منڈاؤ۔ مولانا نے ایک
ملاقات میں مجھ سے فرمایا کہ تم نے انگریزی اُردو لغت لکھ کر بڑا کام کیا لیکن
اس کا آدھا فائدہ تم نے غارت کر دیا۔ میں نے پوچھا وہ کیسے؟ فرمایا کہ اُردو
ترجمہ عربی فارسی خط میں فضول لکھا رومن حروف میں لکھنا چاہیے تھا تاکہ
سارے عالم کو فائدہ پہنچتا۔

ان حالات کو دیکھ کر میں سیّد احمد خاں کو کس مُنہ سے بُرا کہوں اس خدا
کے بندے نے تو اس کا عشر عشیر بھی نہ کیا تھا۔ البتہ ابتدا اس کی طرف سے
ہوئی۔ مگر یہ غلو نہ تھا۔ اب یہ باتیں پُرانی ہو گئی ہیں۔ نقالی کا پردہ چاک ہو گیا
ہے۔ لوگ اب ان چیزوں کی پروا نہیں کرتے بسرسیّد نے تھوڑی بہت
تبدیلی اپنی طرز معاشرت میں کی وہ کسی ذاتی غرض سے نہ تھی بلکہ اس میں
سراسر قومی مفاد مدِ نظر تھا۔ مولوی نذیر احمد نے جو کسی کی رورعایت نہیں کرتے

تھے، سچ کہا تھا کہ "سید احمد خاں کے ظاہر حال سے دھوکا ہو سکتا ہے کہ وہ اونچے درجے کے انگریزوں کی طرح ماند و بود کرتے ہیں۔ گورنروں کو مہمان رکھتے ہیں، ان کے ہم نوالہ ہیں جس کے دل میں ایسا واہمہ گزرے اُس کو اس بات پر بھی نظر کرنی چاہیئے کہ سید کو چار و ناچار رفیل بانوں کے ساتھ دوستی رکھنی پڑتی ہے اور وہ بڑے پھاٹک بغیر نہیں ہو سکتی۔ اگر انگریزوں کی طرح ہائی لائف نہ رکھیں تو اعلا درجے کا انگریز یا اعلا درجے کا مینٹو اُن کی طرف رُخ نہ کرے۔"

سرسید کا اصلی ذوق علمی و ادبی تھا اور یہ خود اُن کا بیان تھا کہ "جیسا تصنیف و تالیف میں میرا جی لگتا ہے ویسا کسی کام میں نہیں لگتا۔" یہ شوق انھیں ابتدا سے تھا۔ ایک وجہ یہ ہے کہ ان کے نانا دبیرالدولہ امین الملک خواجہ فریدالدین احمد خاں صاحب علم و فضل اور خاص کر علوم ریاضیات میں وحید عصر تھے۔ چنانچہ سرسید نے ان کے بعض رسالوں کا ترجمہ بھی کیا۔ ان کے ماموں یعنی خواجہ فریدالدین کے فرزند نواب زین العابدین خاں بھی فنون ریاضی کے بڑے ماہر تھے۔ سرسید نے ریاضی کی کتابیں اور آلات رصد و اعمال اصطرلاب وغیرہ کے متعدد رسالے ان سے پڑھے۔ اور نانا کے رسائل پیکار منتا سبہ وغیرہ کا اُردو میں ترجمہ کیا۔ اس خاندانی اثر کے علاوہ اس وقت کے باکمال اصحاب مثلاً مرزا غالب، مفتی صدرالدین آزردہ، مولانا صہبائی، نواب ضیاء الدین خاں، نواب مصطفےٰ خاں وغیرہ کی صحبت نصیب ہوئی جس میں علم و ادب اور شعر و سخن کا چرچا رہتا تھا۔ سرسید بھی شعر کہتے تھے اور آہی تخلص کرتے تھے۔ سید الاخبار جو اُن کے بھائی نے ۱۸۳۶ء یا ۳۷ء میں جاری کیا تھا جب کہ اُن کی عمر اٹھارہ اُنیس برس کی تھی۔ اس میں زیادہ تر یہی لکھتے تھے۔ نیز بعض مذہبی اور ریاضیات کے رسائل سے قطع نظر جو انھوں نے ابتدا

میں لکھے اُن کی معرکۃ آلارا تصنیف آثار الصنادید ہے جو پہلی بار ۱۸۴۷ء میں چھپکر
شائع ہوئی۔ اُس وقت اُن کی عمر تیس برس کی تھی۔ یہ پہلی کتاب ہے جو دہلی کی عمارات
پر کمال تحقیق اور غیر معمولی محنت اور صحت سے لکھی گئی ہے۔ حیرت ہے کہ ایسے زمانے
میں اور ایسی صحبتوں میں جب کہ ہمارے ادب کا رنگ کچھ اور ہی تھا اور شعر و
سخن اور مذہبی تعلیم کے سوا دوسری جانب مطلق توجہ نہ تھی، انھیں اس قسم کی
تحقیقات کا خیال کیسے پیدا ہوا۔ اس کی تالیف میں جو محنت و مشقت انھوں نے
اُٹھائی وہ بھی کچھ کم حیرت انگیز نہیں۔ ان کا دوسرا ابتدائی علمی کارنامہ آئین اکبری
کی تصحیح و ترتیب ہے۔ آئین اکبری اپنی نوعیت کی بے نظیر کتاب ہے جو اُس زمانے
کی ہر قسم کی معلومات کا بے بہا خزانہ ہے۔ اس کی زبان اور طرز بیان بھی نرالا ہے پھر
اُس میں معمولی مختلف انواع و اقسام کے معلومات جن کا سلطنت اور حیات انسانی
سے کچھ بھی تعلق ہے ایسے جمع کر دیئے ہیں کہ ان کا صحیح طور پر سمجھنا ہر ایک کا کام نہیں ہے
ایسی کتاب کی تصحیح و ترتیب آسان نہ تھی۔ اس میں انھوں نے تحقیق و تلاش کی
پوری داد دی ہے۔ یہی نہیں کیا کہ متعدد نسخے جمع کر کے اُن کی تصحیح کی ہو بلکہ اصل
کتاب میں جو خامیاں تھیں انھیں رفع کیا اور جو کمیاں تھیں انھیں پورا کیا،
جو فروگذاشتیں تھیں ان کی تکمیل کی اور جو غلطیاں فاضل مصنف سے ہو گئی
تھیں ان کی اصلاح کی۔ کئی سو سکوں کی تصویریں درج کیں اور ان کے دونوں
جانب جو الفاظ تھے وہ نقل کیے۔ اصل کتاب میں کہیں کہیں تصویریں تھیں سر سید
نے بڑے اہتمام اور محنت سے دلی کے چابک دست مصوروں سے بے شمار
تصویریں بنوا کر موقع موقع سے داخل کیں۔ غرض کہ کوئی آئین ایسا نہ چھوڑا
جس کی تصویریں نہ دی ہوں۔ اس کے علاوہ اپنی طرف سے بہت مفید اضافے کیے
سر سید کا یہ کام بھی حیرت انگیز ہے۔ جدید طریقہ تحقیق و ترتیب سے اُس وقت

ہمارے ہاں کوئی آشنا نہ تھا اور نہ اس قسم کے کاموں کا کسی کو شوق تھا اور نہ اُن کی کوئی قدر تھی۔ تاہم سرسید نے جس ژرف نگاہی، محنت و مشقّت اور تحقیق و تلاش سے اس کام کو انجام دیا آج کل کا بڑے سے بڑا محقق بھی اس سے زیادہ نہیں کر سکتا۔ ۔ ۔ ۔ ان دو کتابوں کی ہمارے ملک میں تو کچھ قدر نہ ہوئی اور قدر ہوئی تو یورپ میں۔ اُس وقت سے جو تالیف و تصنیف کا تانتا بندھا تو آخر دم تک جاری رہا۔ تاریخِ فیروز شاہی کی تصحیح و ترتیب بھی کی جو ایشیاٹک سوسائٹی نے ۱۸۶۲ء میں شائع کی اور بعد میں تزکِ جہانگیری کو مرتب کیا۔

میرا مقصود یہاں اُن کے علمی کارناموں پر تبصرہ کرنا نہیں ہے بلکہ یہ بتانا چاہتا تھا کہ تالیف و تصنیف کا شوق انھیں ابتدا سے تھا۔ لیکن جو بات میں کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ علاوہ اُن گوناگوں احسانات کے جو سرسید نے ہماری قوم پر کئے ان کا ایک بہت بڑا احسان اُردو زبان پر ہے۔ ان کی تالیف و تصنیف کا زمانہ ۱۸۴۰ء سے شروع ہوتا ہے جب کہ اُن کی عمر بائیس تیئیس سال سے زیادہ نہ تھی۔ اس ابتدائی زمانے کی تالیفات چند مذہبی یا ریاضی کے رسائل تھے۔ اُن کی اصل تصنیف آثار الصنادید جو فی الواقع ایک علمی تصنیف ہے ۱۸۴۷ء میں شائع ہوئی۔ اسی زمانے کے لگ بھگ ۱۸۴۵ء میں مرزا رجب علی بیگ سرور نے فسانۂ عجائب لکھا۔ یہ کتاب از اوّل تا آخر مقفّٰی اور مسجّع عبارت میں ہے۔ تکلّف و تصنّع کا عجیب و غریب نمونہ ہے۔ اس قسم کی عبارت آرائی اور قافیہ پیمائی ایسے حالات و واقعات اور جذبات و خیالات کے ادا کرنے سے قاصر رہتی ہے جن کا صداقت سے کچھ تعلق ہو۔ یہ عارضہ لکھنؤ میں بہت پہلے پیدا ہو چکا تھا۔ دلّی کی سلطنت پر جب زوال آیا اور بادشاہ نام کے بادشاہ رہ گئے

تو وہاں کے شعرا اور شرفا نے لکھنؤ کا رُخ کیا جہاں فارغ بالی اور خوش حالی کا سماں اور دولت اور عیش و عشرت کی فراوانی تھی۔ اہل ہنر خاص کر شعرا کی بڑی قدر کی جاتی تھی۔ شعر گوئی فیشن ہو گیا تھا اور شاعر امرا اور بادشاہوں کے درباروں کی رونق اور اُن کی تفریح کا سامان تھے۔ لکھنؤ پہلے ایک بے حیثیت قصبہ تھا۔ اُسے نواب آصف الدولہ کے زمانے میں عروج حاصل ہوا، اور حکومت کا مستقر فیض آباد سے لکھنؤ منتقل ہو گیا۔ اب لکھنؤ دلی کا حریف بن گیا۔ نئی دولت اور نئی حکومت تھی۔ اہل لکھنؤ نے دلّی کے مقابلے میں اپنی جداگانہ حیثیت قائم کرنی چاہی چنانچہ لباس میں، کھانوں میں، گفتگو میں، لہجے میں، طرز عمارت طبابت حتیٰ کہ شعر و سخن میں نئی تراش خراش اور جدّت پیدا کی۔ اُردو ادب میں اُس وقت سارا زور شعر و شاعری پر تھا۔ نثر کو یہ درجہ نصیب نہیں ہوا تھا۔ لکھنوی طرز کے موجد ناسخ ہیں۔ اُن کا کلام بے مزہ، بے جان، بے اثر ہے کسی تحریر یا ادب کی پشت پر جب کوئی صحیح جذبہ یا خیال نہیں ہوتا تو لفظوں سے کھیلنا پڑتا ہے۔ یہی کیفیت ناسخ اور ان کے تلامذہ اور مقلدوں کے کلام کی ہے جو تصنع و تکلّف صنائع دور از کار تشبیہوں، استعاروں اور تلازموں، عربی فارسی کے ثقیل اور غیر مانوس الفاظ سے بھرا ہوا ہے اور بہت سے روزمرہ کے سبک اور شیریں الفاظ کو اس لئے ترک کر دیا کہ وہ عوام کی زبان ہے۔ ناسخ اور اُن کے خاص تلامذہ نے متروکات کا نام اصلاح زبان رکھا تھا۔ فسانۂ عجائب اور نوطرز مرصع اسی قسم کی کتابیں ہیں۔

یہ نثر کا ابتدائی زمانہ تھا۔ صاحب علم اکثر مقفیٰ مسجع نثر لکھتے تھے اور فارسی عربی الفاظ کا زیادہ استعمال ہوتا تھا۔ البتہ فورٹ ولیم کالج کی کتابوں میں سادہ بول چال کی زبان لکھی گئی۔ یہ کالج کے انگریز ناظموں کی ہدایت کا نتیجہ تھا، اس

کالج کی بنیاد اٹھارویں صدی کے آخری ایام میں رکھی گئی اور اُنیسویں صدی کے آغاز میں اُردو کی کتابوں کی اشاعت ہوئی۔ یہ کالج گورنر جنرل مارکوئیس ولزلی نے قائم کیا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹروں کو اس سے اختلاف تھا۔ آخر کئی سال کی مراسلت اور کش مکش کے بعد توڑ دیا گیا۔ سچ یہ ہے کہ جدید نثر کا آغاز اس کالج ہی سے ہوا۔ لیکن اس کی عمر بہت کم ہوئی اور چند سال کے بعد بند ہو جانے سے اُردو ترجمہ و تالیف کا سلسلہ بند ہو گیا۔ اس لئے اس کی کارگزاریوں کا اثر اُردو نثر پر کم ہوا۔ زیادہ تر قصص و حکایات کی کتابیں ترجمہ ہوئیں ان میں سے دو چار زیادہ مشہور اور مقبول ہوئیں۔ تاریخ و مذہب وغیرہ کی بھی دو ایک کتابیں ترجمہ کی گئیں لیکن ان کا رواج نہ ہوا اور نا پید ہو گئیں۔ البتہ دہلی کالج نے مغربی تعلیم کا شعبہ قائم کر کے اُردو کو تمام جدید علوم و فنون کا ذریعۂ تعلیم بنایا۔ ہندوستان کی تعلیمی تاریخ میں یہ پہلا صحیح قدم تھا جو ملک میں علم کی اشاعت کے لئے اُٹھایا گیا تھا۔ اور مختلف علوم مثلاً طبیعیات، کیمیا، تاریخ، قانون وغیرہ کی سو سوا سو کتابیں تالیف و ترجمہ کیں۔ لیکن افسوس کہ چند سال کام کرنے کے بعد اس پر ایک آفت ناگہانی نازل ہوئی یعنی ۵۷ء کی شورش میں اس کی حالت ابتر ہو گئی اور تعلیم و تعلم کا ولولہ دھیما پڑ گیا۔ بعد میں جب دلّی کا تعلق پنجاب سے ہو گیا تو کالج بھی برخاست کر دیا گیا۔ اُس نے ایک ایسے بے مثل علمی کام کا آغاز کیا تھا کہ اگر یہ سیاسی مدبّروں کی ناعاقبت اندیشی سے بچ جاتا اور اس کا سلسلہ جاری رہتا، تو اُردو کی پہلی یونی ورسٹی ہوتا۔ فرماں روایان وقت کی تنگ نظری اور نا اہلی نے ہماری علمی ترقی کو سخت صدمہ پہنچایا۔ اُس نے جو کام کیا تھا ادھورا رہ گیا اور پھر کسی کی یہ ہمّت نہ ہوئی کہ جو تار جہاں سے ٹوٹا تھا اُسے جوڑتا۔ وہیں چھٹی ہوئی منزل تک پھر سے پہنچنے کے لئے ہمیں پوری ایک صدی لگی۔

یہ دونوں ادارے بے وقت چل بسے اس لئے کہ جن کے ہاتھ میں ان کی موت وحیات تھی، اُن میں کوئی بھی ان کا قدر دان نہ تھا۔ لوگ ان کے کارناموں کو بھول بھال گئے اور ان کا اثر جیسا کہ ہونا چاہئے تھا نہ ہو سکا۔ اُنھوں نے جو کچھ کیا بہت قابل قدر ہے لیکن اُردُو زبان میں ابھی تک وہ توانائی پیدا نہیں ہوئی تھی جو ایک زبان کے ادب کے لئے لازم ہے۔ سیّد احمد خاں نے اس کے قالب میں ایک نئی روح پھونکی اور اُردُو ادب میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ جیسا کہ میں نے اپنے ایک خطبے[1] میں لکھا ہے۔ "اس نے زبان کو پستی سے نکالا، انداز بیان میں سادگی کے ساتھ قوت پیدا کی۔ سنجیدہ مضامین کا ڈول ڈالا۔ سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی۔ جدید علوم وفنون کے ترجمے انگریزی سے کرائے۔ خود کتابیں لکھیں اور دوسروں سے لکھوائیں۔ اخبار سائنٹفک سوسائٹی (علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ) جاری کر کے اپنے انداز تحریر، بے لاگ تنقید اور روشن خیالی سے اخبار نویسی کا پایہ بڑھایا۔ تہذیب الاخلاق کے ذریعے اُردُو ادب میں انقلاب پیدا کیا اور اُسے رواج دیا۔ ان کی اور ان کے رفقا کی سعیٔ عمل سے علی گڑھ اُردُو ادب اور روشن خیالی کا ایسا مرکز ہو گیا تھا جس کی فضیلت اور برتری سب نے تسلیم کی ہے۔ یہ اُردُو زبان کے فروغ اور رواج کا زمانہ تھا۔ اور ادب کی تاریخ میں اس کا ذکر ہمیشہ احترام سے کیا جائے گا۔"

سادگی ویُرکاری کمال صناعی ہے۔ اس میں ادب بھی شامل ہے۔ سادہ زبان لکھنا آسان نہیں۔ سادہ زبان لکھنے کے یہ معنے نہیں کہ آسان لفظ جمع کر دیئے جائیں ایسی تحریر سپاٹ اور بے مزہ ہوگی۔ سلاست کے ساتھ لطف بیان اور اثر بھی ہونا چاہئے۔ یہ صرف باکمال ادیب کا کام ہے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے کہ زبان پر پوری قدرت

---

[1] خطبۂ صدارت شعبۂ اُردُو آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ۔ ۱۴ فروری ۱۹۳۷ء۔

ہو اور اسی کے ساتھ موضوع تحریر پر بھی کافی وسیع اور گہری نظر ہو۔ اسی لئے کسی
فن یا علم کی ابتدائی یا آسان کتابیں ایسا ہی شخص لکھ سکتا ہے جسے اپنے فن یا علم پر
کامل عبور ہو۔ وہ اپنے خیالات کو سادہ الفاظ میں ایسے مرغوب طرز بیان کے ذریعہ
عام فہم مثالیں دے کر ادا کرتا ہے کہ مضمون قابل فہم اور دلکش ہو جاتا ہے جن کا
علم ادھورا ہوتا ہے وہ کبھی اپنے خیالات صفائی اور خوبی سے ادا نہیں کر سکتے تحریر
یا تقریر کا مقصد ہوتا ہے کہ لوگ اُسے سمجھیں اُس کے اثر کو قبول کریں اور لطف اٹھائیں
اگر یہ نہیں تو تحریر یا تقریر محض بے کار اور تضیع اوقات ہے۔ سرسید کی تحریر اسی لئے
مقبول ہوئی کہ وہ سادہ، پر اثر اور پرخلوص تھی۔ معمولی پڑھے لکھے شخص کی سمجھ میں
بھی آتی اور اس کے دل میں گھر کرتی۔ ان کے دل میں قوم کا درد تھا اور اُس
نے اُن کی تحریر میں سادگی اثر اور خلوص پیدا کر دیا تھا۔ یہ اثر رنگین عبارت مقفیٰ مسجع
جملوں تشبیہوں اور استعاروں کے ایچ پیچ سے نہیں پیدا ہو سکتا۔

وہ اپنے مطلب کو سادہ لفظوں میں صاف صاف بیان کرنے کا بہت
خیال رکھتے تھے۔ اور دوسروں کو بھی اس کی تاکید کرتے تھے۔ مثلاً وہ فرماتے تھے
کہ بعض اوقات ضمیروں کے لانے سے مفہوم کے سمجھنے میں دشواری ہو جاتی ہے
اور سوچنا پڑتا ہے کہ فلاں ضمیر کا مرجع کون ہے۔ ایسی حالت میں اسم کا اعادہ
مناسب ہے خواہ کتنی بار دُہرانا کیوں نہ پڑے۔ اس کی پروا نہیں کرنی چاہئے
کہ اس سے عبارت کی روانی یا حسن میں فرق آ جائے گا۔ مفہوم کا صاف
ہونا سب سے ضروری ہے۔ تار لکھنے میں لوگ بڑی خست سے کام لیتے ہیں
اور یہ کوشش کرتے ہیں کہ کم سے کم الفاظ میں مطلب ادا ہو جائے اس سے وہ بہت
ناراض ہوتے تھے اور کہتے دو چار پیسوں کی خاطر مکتوب الیہ کو اُلجھن میں کیوں
ڈالتے ہو۔ وہ کہا کرتے تھے کہ میں ایسا لکھنا چاہتا ہوں کہ میرا سائیس اور گھر کی

اما بھی اُسے سمجھ لے۔ ایک روز میں مولانا شبلی سے (جب وہ حیدرآباد میں تھے) ملنے گیا۔ مولانا برابر ٹہل رہے تھے اور کسی خیال میں محو تھے۔ آخر مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے پوچھا مولانا آپ کس سوچ میں ہیں (اس زمانے میں مولانا علم الکلام لکھ رہے تھے) فرمانے لگے، میں اب اس مقام پر پہنچا ہوں جہاں مجھے وحی الہام پر کچھ لکھنا ہو۔ لیکن سید احمد خاں نے اس مضمون کو اپنی تحریر سے ایسا پانی کر دیا ہو کہ میں اب یہ سوچ رہا ہوں کہ اُسے کس ڈھنگ سے لکھوں سرسید کا یہ کمال تھا کہ کیسا ہی مشکل اور پیچیدہ مسئلہ ہو وہ اس خوبی اور صفائی سے بیان کرتے کہ پڑھنے والے کے ذہن میں اُترتا چلا جاتا تھا۔

سرسید نے خود بھی تہذیب الاخلاق کے چار سال کے ختم ہونے پر اپنے اس کام کے متعلق کچھ لکھا ہو لکھتے ہیں کہ:۔

"جہاں تک ہم سے ہو سکا ہم نے اردو زبان کے علم ادب کی ترقی میں اپنے ان ناچیز پرچوں کے ذریعے سے کوشش کی مضمون کی ادا کا ایک سیدھا اور صاف طریقہ اختیار کیا۔ جہاں تک ہماری کج مج زبان نے یاری دی الفاظ کی درستی، بول چال کی صفائی پر کوشش کی۔ رنگینیٔ عبارت سے جو تشبیہات اور استعارات خیالی سے بھری ہوتی ہے اور جس کی شوکت صرف لفظوں ہی لفظوں میں رہتی ہے اور دل پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا، پرہیز کیا۔ تک بندی سے جو اُس زمانے میں مقفیٰ عبارت کہلاتی تھی ہاتھ اٹھایا۔ جہاں تک ہو سکا سادگی عبارت پر توجہ کی۔ اس میں کوشش کی کہ جو کچھ لطف ہو وہ صرف مضمون کے ادا میں ہو جو اپنے دل میں ہو وہی دوسرے کے دل میں پڑے تاکہ دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے ہم کچھ نہیں کہہ سکتے کہ ہماری یہ کوشش کہاں تک کارگر ہوئی اور

ہمارے ہم وطنوں نے اس کو کس قدر پسند کیا۔ مگر اتنی بات ضرور دیکھتے ہیں
کہ لوگوں کے خیالات میں ضرور تبدیلی آگئی ہے اور اُس کی طرف لوگ متوجہ
بھی معلوم ہوتے ہیں۔ اخباروں کی عبارتیں نہایت عمدہ اور صاف ہوتی جاتی
ہیں۔ وہ پہلا ناپسندیدہ طریقہ اداے مضمون کا بالکل اُٹھتا جاتا ہے۔ بھاری بھاری
لفظوں اور موٹے موٹے لغتوں سے اُردو زبان کا خون نہیں کیا جاتا۔ صفائی
اور سادگی روز بروز عبارتوں میں بڑھتی جاتی ہے۔ خیالات بھی بدلے ہوئے
ہیں۔ بہت کم اخبار ایسے ہوں گے جن میں ہفتہ کوئی نہ کوئی آرٹیکل عمدہ اور
سلیس عبارت میں کسی نہ کسی مضمون پر نہ لکھا جاتا ہو۔ صرف اس بات کی
کمی ہے کہ وہ سامان پاس موجود نہیں جس سے ہمارے معلومات زیادہ ہوں
اور ہمارے خیالات کو وسعت ہو۔ جو مضمون ہم لکھنا چاہیں اُن کے ماخذ اور
اُن کے حالات اور جو بحثیں اُن پر ہو چکی ہیں اور جو امور اُن کی نسبت متحقق
ہو چکے ہیں اُن سے آگاہی ہو۔ اور یہی سبب ہے کہ بعض دفعہ ہماری قوم کے
آرٹیکلوں میں غلطی ہو جاتی ہے اور جن اُمور کا تصفیہ ہو چکا ہے انھیں کو پھر
کہے جاتے ہیں۔ یہ نقص اُسی وقت رفع ہوگا جب کہ انواع اقسام علوم و فنون
کی کتابیں ہماری زبان میں موجود ہو جاویں گی اور ہماری قوم کی عموماً اُن پر
دسترس ہوگی۔ سوسائٹی علی گڑھ نے اس کام کے پورا کرنے کا ارادہ کیا تھا
مگر افسوس ہے کہ قوم کو اس طرف توجہ نہیں ہے اور اسی سبب سے اس کا کام
ادھورا پڑا ہے۔

نئی اُردو نے درحقیقت ہماری ملکی زبان میں جان ڈال دی ہے۔ میر و
درد و ظفر نے اُردو اشعار میں جو کچھ سحر بیانی کی ہو کی ہو۔ میر امن نے کوئی
کہانی شستہ بول چال میں کہہ دی ہو کہہ دی ہو۔ جو اس سے زیادہ فصیح و دلکش حسب

وبامحاورہ نہ ہوگی جو ایک پوپلی بڑھیا بچوں کے سُلاتے وقت ان کو کہانی سُناتی ہو۔ مضمون نگاری دوسری چیز ہے جو آج تک اُردو زبان میں نہ تھی یہ اِسی زمانے میں پیدا ہوئی اور ابھی نہایت بچپن کی حالت میں ہے۔ اگر ہماری قوم اس پر متوجہ رہے گی اور ایشیائی خیالات کو نہ ملائے گی جو اب حد سے زیادہ اجیرن ہو گئے ہیں تو چند روز میں ہماری ملکی تحریریں بھی میکالے اور اڈیسن کی سی ہو جائیں گی۔"

تین سال بعد وہ پھر لکھتے ہیں کہ

"اُردُو زبان کا علم ادب جو بد خیالات اور موٹے دھدّے الفاظ کا مجمع ہو رہا ہے اسمیں بھی جہاں تک ہم سے ہوسکا ہم نے اصلاح چاہی۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ ہم نے اسمیں کچھ کیا۔ مگر ہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے اپنی دانست میں ان باتوں پر بقدر اپنی طاقت کے کوشش کی۔ قومی ہمدردی قومی عزّت سلف آنر یعنی اپنے آپ عزت کا خیال اگر ہم نے اپنی قوم میں پیدا نہ کیا تو ان لفظوں کو تو ضرور اُردُو زبان کے علم ادب میں داخل کیا ہم نے کچھ کیا ہو یا نہ کیا ہو مگر ہر طرف سے تہذیب و شائستگی کا غلغلہ سنا، قومی ہمدردی کی صداؤں کا ہمارے کانوں میں آنا، اُردُو علم ادب کا ترقی پانا، یہی ہماری مرادیں تھیں جن کو ہم نے بھر پایا۔"

اس میں ذرا شبہ نہیں کہ تہذیب الاخلاق یعنی سرسیّد کی تحریروں نے قوم میں بیداری اور روشن خیالی پیدا کی۔ توہمات اور تعصبات کے مٹانے میں بڑا کام کیا متین، سادہ اور خوشگوار نثر لکھنا اسی نے سکھایا حقیقت یہ ہو کہ اُردُو نثر میں جو انقلاب اور ترقی ہم اس وقت دیکھتے ہیں اور اس میں جو وسعت اور ادبی علمی صلاحیت پائی جاتی ہے وہ سیّد کا طفیل ہو۔ یوں تو ان کی ساری عمر

لکھنے پڑھنے اور تالیف و تصنیف میں گزری لیکن جب تک وہ پنشن لے کر علی گڑھ آئے اور کالج کا کام سنبھالا، علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور تہذیب الاخلاق جاری کیا، سائنٹفک سوسائٹی قائم کی، ان کا سارا وقت صبح سے شام تک لکھنے لکھانے ہی میں گزر جاتا تھا۔ ان کے علاوہ اور بہت سے کام نکلتے رہتے تھے، مثلاً سیاست مذہب، جلسے، اڈریس، تقریریں، رپورٹیں، روئدادیں مراسلت وغیرہ یہ سب کچھ وہ خود ہی لکھتے تھے۔ جو شخص دن رات لکھتا رہے اور اس قدر مختلف شعبوں اور موضوعات پر لکھے اور جسے ایک بار لکھنے یا لکھانے کے بعد دوبارہ دیکھنے یا نظر ثانی کی فرصت نہ ملے اس سے یہ توقع کرنا کہ اُس کی ہر تحریر ادب کا اعلا نمونہ ہو، عبث ہے۔ پھر ادائے مطلب میں صفائی اور سادگی کا اس قدر خیال تھا کہ بعض اوقات وہ مضمون کو عام فہم بنانے کی خاطر حسن بیان کو قربان کر دیتے تھے۔ اس وجہ سے اکثر ان کی عبارت سُست اور پھُس پھُسی معلوم ہوتی ہے، لیکن جو ادبی یا علمی تحریریں اور مضامین دل لگا کر لکھے ہیں وہ حسن بیان، خوبی، خیالات اور زبان کی سلاست و فصاحت کے اعتبار سے، اُردو ادب کے خزانے میں بے نظیر جواہر پارے ہیں۔ ان میں تمام ادبی خوبیاں ہیں تلمیحات بھی ہیں، تشبیہات و استعارات بھی ہیں، محاورات بھی ہیں، لطف زبان بھی ہے مزاح اور ظرافت کی چاشنی بھی ہے لیکن ہر چیز اپنے محل پر ہے اور تکلف و تصنع سے بری، وہ دوسرے ادیبوں کی طرح الفاظ اور محاورے سوچ سوچ کر اور ڈھونڈ ڈھونڈ کر نہیں لکھتے تھے اور نہ عبارت کے بنانے اور سنوارنے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ شروع سے آخر تک بلا توقف اپنے خیالات لکھتے چلے جاتے تھے اور پوری تحریر ایک مسلسل خوب صورت لڑی ہوتی تھی۔ میں اس کی بہت سی مثالیں پیش کر سکتا ہوں، لیکن طوالت کے خوف سے معذور ہوں البتہ ان کی

ایک چھوٹی سی تصنیف "سیرت فریدیہ" کا نام لیتا ہوں۔ اس میں انھوں نے اپنے نانا
والدہ اپنی تعلیم، قلعہ اور اُس وقت کی سوسائٹی کے حالات بڑی بے تکلفی اور خوبی
سے نہایت سادہ عبارت میں لکھے ہیں یہ بڑا اچھا نمونہ ہے کہ ہمیں سوانح اور واقعات
کس ڈھنگ سے بیان کرنے چاہئیں۔

اُن کی تحریروں میں جگہ جگہ انگریزی لفظ آتے ہیں جس کی لوگوں کو شکایت
تھی، اس کا انھوں نے خود ہی جواب دیا ہے۔

"بعض لوگوں کو شکایت ہے کہ جو لوگ اس زمانے میں اُردو لکھتے ہیں وہ انگریزی
لفظ اپنی تحریروں میں ملاتے ہیں۔ مگر ان کو غور کرنا چاہیئے کہ زندہ زبان میں ہمیشہ
نئے نئے لفظ ملتے اور بنتے ہیں اور جب کوئی زبان محدود ہو جاتی ہے وہ مردہ
کہلاتی ہے۔ غیر زبان کے الفاظ کو اپنا کر لینا اہل زبان کا کام ہے مگر ان کا
ملا لینا آسان کام نہیں۔ اہل زبان غیر زبان کے الفاظ ایسی عمدگی سے ملا لیتے ہیں
جیسے تاج گنج کے روضے میں سنگ مرمر پر عقیق و یاقوت و زمرد کی پچی کاری
ہے بے شک وہ دوسرا پتھر ہے مگر ایسا وصل ہوا ہے کہ غور سے دیکھنے پر بھی اوپر
سے جڑا ہوا نہیں معلوم ہوتا اسی میں سے پیدا ہوا معلوم ہوتا ہو۔ یہ بات اہل زبان
کے سوا دوسرے سے نہیں ہو سکتی اور نہ سب اہل زبان سے بلکہ صرف اُس سے
جسے خدا نے ایسا ملکہ دیا ہو۔

یہ بات بھی غور کرنی چاہیئے کہ اہل زبان کو دوسری زبان کے لفظوں کے
لے لینے کی کیوں ضرورت پڑتی ہے۔ اُس کے متعدد اسباب ہوتے ہیں۔ ایک
مورخ جو کسی ملک کی تاریخ لکھتا ہے اُس کو ضرور ہوتا ہے کہ اس ملک کے تاریخی
الفاظ یعنی جو تاریخ سے تعلق رکھتے ہیں اور ملکوں کی تقسیم اور مناصب اُسی
ملک کی زبان میں قائم رکھے۔ کیوں کہ اگر اُن کے لئے اپنی زبان کے الفاظ

اور اصطلاح سے بدل دے تو وہ تاریخ نہایت نکمّی اور غیر مفید ہو جائے گی۔ ٹیونس میں
جو تاریخیں غیر ملکوں کی عربی زبان میں ترجمہ نہیں، تصنیف ہوئی ہیں۔ اُن کو دیکھو
کہ کس قدر غیر زبان کے الفاظ معرّب اور غیر معرب ان میں شامل ہیں۔ عربی
اخبار الجوائب کو دیکھو اس کا کیا حال ہے۔ قرآن مجید کو پڑھو اور دیکھو اس میں کس قدر
الفاظ دوسری زبانوں کے داخل ہیں۔ اگر عربی زبان کے علم ادب اور علوم و فنون
میں الفاظ جدیدہ شامل ہونے بند ہو جاتے تو وہ بھی مثل عبرانی و سنسکرت وژند
کے مُردہ زبان ہو جاتی۔

"علوم و فنون پر کتابیں لکھنے والا بعض دفعہ مجبور ہو جاتا ہے کہ جس زبان سے
اُس علم کو لیا ہے اسی زبان کے بعض الفاظ اور مصطلحات بدستور قائم رکھے۔
دیکھو یونانی زبان سے جو علم طب . . . . عربی میں ترجمہ ہوا کس قدر یونانی الفاظ
اس میں شامل ہیں۔ عربی زبان سے کیمسٹری انگریزی میں گئی آج تک بہت سے
عربی لفظ انگریزی زبان کی کیمسٹری میں شامل ہیں۔

" پوچھو اس مقام پر میں نے کیوں لفظ کیمسٹری بولا اور کیمیا کا لفظ جس سے خود
انگریزوں نے کیمسٹری بنایا ہے کیوں نہ بولا اس کا سبب یہ ہے کہ ہم لوگوں میں
کیمیا کے لفظ کے ساتھ چاندی سونا بنانے کا خیال پیدا ہوتا ہے جو ایک محض غلط
خیال ہے۔ اب وہ شخص جو اپنی قوم کی ہمدردی رکھتا ہے اور اُن غلط خیالات کو
مٹانا چاہتا ہے کسی جگہ کیمسٹری اور کسی جگہ کیمیا کا لفظ بول جاتا ہے تاکہ کیمسٹری کا
لفظ اُس غلط خیال کو نہ آنے دے اور کیمیا کا لفظ کیمسٹری اور کیمیا کے ایک ہونے
کا خیال پیدا کرے۔"

اُس کے بعد لفظ کی خوبی اور صلاحیت اور غلط اور صحیح پر بحث کر کے لکھتے
ہیں بد دوسری زبان کے لفظوں کو اپنی زبان میں بولنا کبھی عبارت کا لطف

بڑھانے کے لئے ہوتا ہے، کبھی اپنی زبان کو وسعت دینا اور نئے لفظوں کو اس میں داخل کرنا مقصود ہوتا ہے، کبھی سامعین کو مطلب کی طرف زیادہ متوجہ کرنے کے لئے بولا جاتا ہے، کبھی اس مطلب کی عظمت جتانے کو کہا جاتا ہے جو عظمت اُس مرادف سے جو اُس زبان میں مستعمل ہے دل میں نہیں بیٹھتی۔ ...... پس محبِّ قوم اہل زبان اُن خیالوں کو دل میں ڈالنے کے لئے اپنی زبان کو وسعت دیتا ہے اور دوسری زبان کا نیا لفظ اپنی زبان میں ملاتا ہے تاکہ نئے لفظ کے ساتھ نیا خیال دل میں پیدا ہو۔"

اپنی زبان میں غیر زبانوں کے لفظ لینے کی بحث بہت دلچسپ اور طویل ہے۔ یہاں اس کا موقع نہیں۔ اپنے مضمون "اُردو میں دخیل الفاظ" میں اس پر کافی بحث کر چکا ہوں۔ سرسیّد کی تحریر کا خلاصہ یہ ہے کہ بعض اوقات ضرورت یا مجبوری سے غیر زبان کے لفظ لینے پڑتے ہیں، یہ زیادہ تر اصطلاحی یا صنعت و حرفت اور سائنس کے لفظ یا اصطلاحات ہوتی ہیں۔ ایسی صنعت و حرفت اور فنون جو اپنے ملک میں نہیں ہوتے، اور غیر ملک سے آتے ہیں تو ان کے ساتھ بہت سے مخصوص لفظ بھی آ جاتے ہیں۔ یا ایسے لفظ یا اصطلاحیں جو اعلام سے منسوب ہوتی ہیں بجنسہ لے لینی پڑتی ہیں۔ دوسری بات اُنھوں نے یہی ہے کہ بعض غیر زبان کے لفظ عظمت اور دلنشینی کی خاطر استعمال کرنے پڑتے ہیں اگرچہ ان کے مترادف اپنی زبان میں موجود ہیں یہ بات کسی قدر صحیح ہے۔ مثلاً سرسیّد اور ان کے معاصر سویلزیشن کا لفظ استعمال کرتے تھے اگرچہ تمدّن کا لفظ ہمارے ہاں موجود ہے لیکن اس سے وہ مفہوم پوری طرح ادا نہ ہوتا تھا جو سویلزیشن سے ہوتا ہے۔ اب چونکہ ایک مدّت سے ان معنوں میں استعمال ہوتا چلا آتا ہے اس لئے سویلزیشن کا قائم مقام ہو گیا ہے۔ ایک بات یہ بھی تھی کہ نئے تعلیم یافتہ اصحاب

کی نظروں میں سویلزیشن کے لفظ میں جو عظمت اور جاذبیت تھی وہ تمدّن میں نہ تھی۔ ان کے سامنے ان معنوں میں تمدّن کہا جاتا تو وہ شاید سمجھتے بھی نہیں۔ آجکل مثلاً کلچر کا لفظ ہے اس کے لئے ایک نیا لفظ ثقافت استعمال ہوتا ہے مگر یہ لفظ ثقیل اور نا مانوس ہے۔ اس کا مادہ یا اس سے مشتق کوئی دوسرا لفظ ہماری زبان میں کبھی استعمال نہیں ہوا۔ لوگ اس لفظ کو لکھتے تو ہیں مگر مجبوری سے خوشی سے نہیں۔ دوسرا لفظ اس کی جگہ تہذیب کا مفہوم ہماری زبان میں وہ نہیں جو کلچر میں ہے۔ ان دو لفظوں کے ہوتے ہوئے لکھنے والا مطمئن نہیں ہوتا اور کبھی نہ کبھی کلچر لکھ ہی جاتا ہے۔ جب ایک مدّت کے استعمال اور رواج سے ان میں سے کوئی ایک لفظ اپنی جگہ بنا لے گا تو وہ کلچر کا قائم مقام ہو جائے گا۔ لیکن ایک محبِّ قوم اور مصلح میں بڑی بے صبری اور عجلت ہوتی ہے وہ اتنے دنوں تک انتظار نہیں کر سکتا۔ وہ اپنے خیالات اور منصوبوں کو جلد سے جلد عمل میں لانا چاہتا ہے۔ ایسی حالت میں وہ معذور ہے اور ہم اس پر گرفت نہیں کر سکتے۔

اُردو نظم کے متعلق بھی اُنھوں نے گاہے گاہے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ یہاں میں ان کا صرف ایک قول نقل کرتا ہوں جس سے معلوم ہوگا کہ آج سے ۷۷ برس پہلے اُنھوں نے ردیف و قافیہ و اوزان کی پابندی اور معرّیٰ اور آزاد نظم کے متعلق جو خیال ظاہر کیا تھا اور جس کا اب کچھ کچھ رواج ہو چلا ہے، وہ اُن کی ادبی ترقی پسندی کا بیّن ثبوت ہے۔ اور یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس معاملے میں بھی وہ اپنے زمانے سے کس قدر آگے تھے۔

"ہم نے جو نیچر کی بہت ہائے پکار کی تو اب اس کا قافیہ کیچڑ تو نہیں رہا بلکہ شاعروں نے اُس کی طرف توجہ کی۔ ہماری زبان کے علم ادب میں بڑا نقصان یہ

تھا کہ نظم پوری نہ تھی۔ شاعروں نے اپنی ہمّت عاشقانہ اور واسوختوں اور مدحیہ قصیدوں اور ہجر کے قطعوں اور قصّہ دکہانی کی مثنویوں میں صرف کی تھی۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ ان مضامین کو چھونا نہیں چاہئے تھا نہیں وہ بھی عمدہ مضامین ہیں اور جودتِ طبع اور تلاشِ مضمون کے لئے نہایت مفید ہیں۔ مگر نقصان یہ تھا کہ ہماری زبان میں صرف یہی تھا۔ دوسرے دوسری قسم کے مضامین جو درحقیقت وہی اصلی مضامین ہیں اور نیچر سے علاقہ رکھتے ہیں نہ تھے۔ نظم کے اوزان بھی وہی معمولی تھے ردیف و قافیہ کی پابندی گویا ذاتِ شعر میں داخل تھی۔ رجز و بے قافیہ شعرگوئی کا رواج ہی نہ تھا اور اب بھی شروع نہیں ہوا۔ ان باتوں کے نہ ہونے سے حقیقت میں ہماری نظم صرف ناقص ہی نہ تھی بلکہ غیر مفید بھی تھی۔"

سرسیّد کو فارسی اور اُردُو ادب سے خاص لگاؤ تھا چنانچہ سائنٹفک سوسائٹی اس غرض سے قائم کی کہ تاریخی اور علمی کتابیں انگریزی سے اُردُو میں ترجمہ کرائی جائیں اور بقول مولانا حالیؔ کے "اس بات کو انگریزی تعلیم کے پھیلانے سے بھی زیادہ ضروری اور مقدم سمجھا" خود بھی دو کتابیں لکھنے کا ارادہ کیا۔ ایک اُردُو لغات جسے لکھنا شروع کر دیا تھا اور اس کا نمونہ اپنے اخبار میں شائع کیا دوسری اُردُو ادب کی تاریخ یا فہرست جس میں تمام کتابوں کا جو ابتدا سے اس وقت تک چھپی ہیں، نام، مصنّف کا حال، تصنیف کا زمانہ، طرزِ بیان اور اس کی عبارت کے نمونے اور بعض مضامین کا خلاصہ درج ہوگا۔ اس کتاب کے لکھنے کی نوبت نہ آئی۔ اس سوسائٹی نے چالیس کتابیں شائع کیں، یہ سراسر انھیں کی کوشش اور توجہ کا نتیجہ تھا۔ افسوس کہ وہ دوسرے ایسے ضروری کاموں میں پھنس گئے کہ یہ کام ناتمام رہ گیا۔ البتہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور تہذیب الاخلاق نے اُردُو تحریر اور اسلوب بیان کی اصلاح میں بڑا کام کیا جس سے ادبی شان

بڑھ گئی۔ اور اس وقت جو ہم اپنی زبان میں ادبی اور علمی خیالات کے ادا کرنے کی صلاحیت دیکھتے ہیں وہ زیادہ تر اسی کا فیض ہے۔

۱۸۶۷ء میں سر سید نے برٹش انڈین ایسوسی ایشن کی جانب سے (جس کے بانی و سکریٹری وہ خود تھے) ایک عرضداشت دربارۂ قیام "ورنیکلر یونی ورسٹی" گورنر جنرل باجلاس کونسل کی خدمت میں بھیجی۔ یہ بڑی اہم دوررس اور اصلاحی بلکہ انقلابی تحریک تھی۔ عرضداشت کی ابتدا میں تعلیم کی غرض و غایت بیان کی ہے اور اُس کی رو سے مروجہ طریقۂ تعلیم ناقص اور غیر کافی بتایا ہے "جو گورنمنٹ سوا اُن غرضوں اور کسی قسم کی اور شاید اس کم خواہش کے سبب سے اپنی رعایا کی تعلیم پر آمادہ ہو کہ ان کو صرف اس قدر تعلیم دی جائے کہ وہ اپنی زندگی کے معمولی کاروبار کے انجام دینے کے لائق ہو جائیں تو وہ گورنمنٹ رعایا کے ساتھ اس سے زیادہ کچھ نہیں کرے گی جو ایک آدمی اپنا بوجھ کھچوانے یا کوئی کام لینے کی غرض سے کسی جانور کے ساتھ اس کے سدھانے میں کرتا ہے" اس کے بعد لکھا ہے کہ "تعلیم جواب ترقی کرنے سے تھکی ہوئی ہے" اس کے کئی باعث ہیں جن میں سب سے بڑا باعث یہ ہے کہ ذریعۂ تعلیم انگریزی ہے۔ ایک ایسی غیر اور اجنبی زبان کے ذریعہ تعلیم دینے سے جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں اسکی صراحت کی ہے۔" مگر جس تجویز کو ہم گورنمنٹ اور لوگوں کے غور و فکر اور تصفیہ کرنے کے واسطے پیش کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ جس حالت میں ہم انگریزی کی تعلیم قائم رکھیں اور اس کی ترقی میں کوشش کریں تو کیا ہم کسی دیسی زبان کو اس قسم کا ذریعہ اختیار اور تجویز نہیں کر سکتے جو ایک غیر ملک کی نسبت علم کے عموماً شائع ہونے اور لوگوں کے خیالات اور طور طریقے اور اخلاق کی ترمیم کے زیادہ تر مناسب ہو؟ کیا اہل یورپ کی روشن ضمیری اور شائستگی اور فضل و کمال کی

تعلیم ایسی زبان کے ذریعہ سے جس سے وہ نا آشنا ہیں اور وہ ایک غیر ملک کی ایسی زبان ہے جس کی تحصیل ممکن نہیں کہ ہندستان مقبوضۂ سرکار کے چودہ کروڑ باشندے کر لیویں بہتر اور عمدہ نہیں ہو سکتی؟ یہ ممکن نہیں کہ ان کروڑوں آدمیوں کو ایک ہی زبان اور وہ بھی نئی سکھائی جا سکے۔ یہ کب ہو سکتا ہے کہ ہم خدا تعالیٰ کی اس قدرت کے برخلاف عمل کر سکیں جو بابل کے منار پر اس نے دکھائی ہیں اگر یہ بات ممکن نہیں تو بجز اس کے اور کوئی علاج اور تدبیر نہیں کہ اہل یورپ کی روشن ضمیری اور ان کا علم وفضل لوگوں کے علی العموم سکھانے کے لئے دیسی زبان کو ذریعہ ٹھہرایا جائے۔" عرضداشت میں سول انجینئرنگ کالج رڑکی اور مڈیکل کالج آگرہ کی نظیر بھی پیش کی گئی۔ جہاں شاخ اُردو کے طالب علم اُردو کے ذریعے سے تعلیم پاتے ہیں۔ اُن کو وہی کتابیں جو انگریزی میں ہیں اُردو میں ترجمہ کر کے پڑھائی جاتی ہیں۔ اُردو کے طالب علم اپنے ہم سر انگریزی طالب علموں سے ان مضامین کی تحصیل میں پیچھے نہیں رہتے۔ بعض اوقات اُردو فریق کا طالب علم اپنے ہم سر انگریزی طالب علم سے سبقت لے جاتا ہے۔

مقصد یہ تھا کہ یا تو اس غرض کے لئے یونی ورسٹی قائم کی جائے جس میں وہ تمام علوم وفنون جو کلکتہ یونی ورسٹی میں سکھائے جاتے ہیں، اس درسگاہ میں دیسی زبان کے ذریعہ سے پڑھائے جائیں، ویسے ہی امتحان ہوں جیسے کلکتہ یونی ورسٹی میں ہوتے ہیں! اور اس کے طالب علموں کو ویسی ہی سندیں دی جائیں جو کلکتہ یونی ورسٹی کے کامیاب طلبہ کو دی جاتی ہیں، یا کلکتہ یونی ورسٹی میں ایک شعبہ اسی غرض اور مقصد سے قائم کیا جائے۔ آخر میں بطور دفع مقدر یہ لکھا کہ "یہ بات البتہ سچ ہے کہ بالفعل ایسی کتابیں دیسی

زبان میں موجود نہیں ہیں جن کے ذریعہ سے طالب علم اس درجہ تک علم کی تحصیل کر سکے جواب یونی ورسٹی میں امتحان دینے کے واسطے ضرور ہوتا ہے لیکن ایسی کتابوں کا موجود ہو جانا کوئی مشکل امر نہیں ہے جو کتابیں یونیورسٹی کے امتحان کی فہرست میں مندرج ہیں ان کے ترجمے دیسی زبان میں تیار ہو سکتے ہیں اور بعض مضمونوں کی اصل کتابیں تصنیف ہو سکتی ہیں۔ چنانچہ بہت سے عالم فاضل اِس کام کے لائق موجود ہیں اور علی گڑھ سائنٹفک سوسائٹی اس کام کو انجام دے رہی ہو۔"

یوں تو گورنر جنرلِ نے اپنی خوشنودی اور ہمدردی کا بہت کچھ اظہار کیا لیکن جس امر کا اندیشہ تھا اور جس کے رفع کرنے کی عرضداشت کے آخر میں کوشش کی گئی تھی، جواب میں وہی لکھا ہوا آیا۔ جواب کا خلاصہ یہ ہے۔

(۱) دیسی زبانوں میں ابھی اعلیٰ درجے کی تعلیم کے لئے کافی سامان اور لوازمہ موجود نہیں (۲) صرف ان کتابوں کا ترجمہ جو یونی ورسٹی کے نصاب تعلیم میں داخل ہیں اس قدر کافی نہ ہوگا کہ جس کی بنا پر اس تجویز کو عمل میں لانے کی ہمّت ہو سکے۔ کیونکہ تعلیم یونی ورسٹی کا مقصد صرف اتنا ہی نہیں ہو کہ بعض خاص خاص کتب سے واقفیت ہو جائے بلکہ یہ مقصد ہو کہ یورپ کے علوم و فنون کے فراخ دائرے میں علم کی تحصیل کے لئے طبیعت کو مستعد اور تیار کیا جائے۔ اور کچھ عرصے تک غالباً ہندستان کے باشندے انگریزی کے ذریعہ سے اس بات کو حاصل کر سکتے ہیں (۳) درصورت پسندیدہ ہونے کے بھی گورنمنٹ کے واسطے یہ غیر ممکن ہو کہ ایسے گنجان آباد ملک کو جیسا کہ ہندوستان ہو کامل تعلیم دینے کا کل خرچ اپنے ذمّے لے

اس عرضداشت میں باربار یہ جتایا گیا ہو کہ اس تجویز سے ہمارا ہرگز یہ منشا

نہیں کہ انگریزی کے ذریعہ سے علوم وفنون کی جو تعلیم دی جاتی ہے اس میں کسی قسم کی کمی کی جائے بلکہ اسے ترقی دی جائے۔ ان کا یہ خدشہ وہم کی حد تک پہنچ گیا تھا کہ کہیں گورنمنٹ اس تجویز کی آڑ لے کر انگریزی کی اعلا تعلیم کو بند نہ کردے یا انگریزی زبان کو ثانوی حیثیت دے کر سارا زور مشرقی زبانوں اور مشرقی علوم کی تعلیم میں نہ صرف کردے۔ چنانچہ جب لارڈ لٹن نے پنجاب کے بعض مقامات پر جو تقریریں کیں اور اس کے بعد لارڈ رپن نے ایڈریس کے جواب میں جو تقریر کی ان میں مشرقی زبانوں اور علوم کی تعلیم کو خوب سراہا۔ لارڈ رپن کی تقریر میں یہ الفاظ تھے کہ "ترقی و اشاعت زبان ہائے مشرقی و علوم مشرقی نہایت کار احسن ہے" وغیرہ وغیرہ، تو سرسید کا یہ احتمال قوی ہو گیا کہ گورنمنٹ کی نیت اچھی نہیں اور اگر پنجاب کو یونیورسٹی کا درجہ اور اختیارات مل گئے تو پنجاب میں اعلیٰ تعلیم کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اس بنا پر اُنھوں نے بڑے سخت اور زبردست آرٹیکل اس کی مخالفت میں لکھے اسی طرح جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ الہ آباد یونی ورسٹی اسی ڈھنگ پر بننے والی ہے تو انھوں نے اس کی پرزور مخالفت کی اور لکھا کہ اگر ایسا ہے "تو یہ سوال پیش آتا ہے کہ ہم کو کیا کرنا چاہیے۔ ہماری رائے میں اس کا جواب صاف ہے۔ استقلال، استقلال، استقلال، ہمت، ہمت، ہمت، کوشش، کوشش، کوشش۔ ہم کو گورنمنٹ کی پالیسی کی کچھ پروا نہیں کرنی چاہیے۔ اور اگر ہم میں سیلف رسپکٹ کا کچھ اثر باقی ہے تو گورنمنٹ کو دکھا دینا چاہیے کہ بلاشبہ گورنمنٹ کو لوگوں کی جانوں پر اختیار ہے مگر لوگوں کی رائے پر نہیں۔" یہی شبہ انھیں اس معاملے میں ہوا اور یہ سُن گُن پاکر کہ گورنمنٹ کا منشا کلکتہ یونیورسٹی کو توڑ کر ورنا کیولر یونی ورسٹی قائم

کرنے کا ہے اور انگریزی زبان کی اس میں ثانوی حیثیت ہوگی۔ اس سے ان کا جوش دھیما پڑ گیا۔ کچھ اور حالات بھی ایسے واقع ہوئے کہ یہ کارروائی آگے نہ بڑھ سکی۔

"ورنیکلر" سے سرسید اور اُن کے رفقا یعنی ارکانِ برٹش انڈین ایسوسی ایشن و ارکان سائنٹفک سوسائٹی (جس میں ہندوستانی اور انگریز سب شریک تھے) مراد اُردو زبان تھی، کیونکہ ہندی زبان کی حیثیت اُس وقت ایسی نہ تھی کہ اس بار کی متحمل ہو سکتی، عرضداشت کے اُس فقرے سے یہ بات مترشح ہوتی ہے جس میں سائنٹفک سوسائٹی کے ترجموں کا ذکر کیا ہے اس کے علاوہ اس سے قبل اس کا تجربہ دہلی کالج میں ہو چکا تھا جہاں سب علوم و فنون کی تعلیم اُردو زبان کے ذریعے سے ہوتی تھی اور جتنے ترجمے اور تالیفات وہاں ہوئیں وہ سب اُردو میں تھیں، نیز سول انجینیرنگ کالج رڑکی اور مڈیکل کالج آگرہ میں اُردو فریق کے طلبا کو نصاب کی انگریزی کتابوں کا ترجمہ اُردو میں کر کے پڑھایا جاتا تھا۔ گورنمنٹ کی طرف سے جواب آنے پر اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندوستانیوں مثلاً مولوی ذکا اللہ، ماسٹر پیارے لال، پنڈت دھرم نرائن نے انگریزی کتابوں کا اُردو میں ترجمہ کرنے کی حامی بھری تھی۔

ملک کی بدنصیبی دیکھئے کہ ابھی یہ تجویز معرض بحث میں تھی اور اس کی منظوری اور عمل میں آنے کی بھی کچھ زیادہ توقع نہ تھی کہ زبان کے معاملے میں اختلاف شروع ہو گیا اور اخباروں میں ہندی اُردو کی چھیڑ چھاڑ شروع ہو گئی۔ ہندی والے خود بھی یہ تسلیم کرتے تھے کہ ہندی میں اس قسم کے ترجموں کی صلاحیت نہیں ہے تاہم وہ اس بات پر زور دیتے تھے کہ اُسے ترقی دینے کی کوشش کر کے ترجمے کے قابل بنایا جائے اور اس یونیورسٹی میں مسلمانوں کو اُردو میں اور ہندوؤں کو ہندی میں تعلیم دی جائے

کیا یہ دو قومی نظریہ نہیں ہے؟

اس منصوبے کو عمل میں لانے کے لئے ایک بار پھر کوشش کی گئی کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان کی ایک منتخب کمیٹی میں ایک بڑی طویل تجویز تعلیم مسلمانان کے متعلق پیش کی۔ اس میں مدرسۃ العلوم (محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج) کے قائم کرنے کا بھی ذکر تھا۔ انھوں نے بیان کیا کہ "یہ درحقیقت تین مدرسوں پر مشتمل ہوگا۔ اوّل انگریزی، دوم اُردو، سوم عربی فارسی"۔ اُردو مدرسہ کے متعلق یہ تجویز پیش کی:۔

"اس میں تمام علوم و فنون بزبان اُردو پڑھائیں گے۔ اور جو کچھ تعلیم اس میں ہوگی وہ سب اُردو میں ہوگی۔ البتہ ہر طالب علم کو تین زبانوں میں سے ایک زبان بطور سکنڈ لینگویج کے اختیار کرنی ہوگی، انگریزی، فارسی، عربی۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ جو لڑکا دس بارہ برس کی عمر میں اس مدرسہ میں داخل ہوگا وہ ضرور اٹھارہ برس کی عمر تک تمام سائنس یعنی علوم کو اُردو زبان میں اس قدر تحصیل کرلے گا جس قدر کہ درجہ بی۔ اے کے لئے مقرر ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ مدرسہ جو اس قسم کا تجویز کیا گیا ہے جس میں تمام علوم اُردو زبان میں پڑھائے جائیں گے اس کا سبب یہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ انگریزی مدرسوں میں کافی لیاقت لڑکوں کو نہیں آتی۔ ایک مشکل ان کو غیر زبان کا سیکھنا اور دوسری مشکل غیر زبان میں علوم کا سیکھنا ہوتا ہے پس اس تدبیر سے ہم نے اُن کی ایک مشکل کو موقوف کر دیا ہے تاکہ وہ بسبب اپنی زبان کے علوم و فنون سے نہایت جلد بخوبی واقف ہو جاویں اور بعد اس کے دوسری زبان کے لٹریچر میں محنت کرکے جہاں تک اُن سے ہو سکے ترقی کرلیں۔ اس تدبیر سے ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ بہت کم طالب علم علوم و فنون سے گو کہ وہ اُردو زبان ہی میں کیوں نہ ہوں

ناواقف رہیں گے اور بہ نسبت حال کے لٹریچر پر محنت کرنے کی زیادہ مہلت ملے گی اور ان کو اس زبان کی لٹریچر بہ نسبت حال کے بہت زیادہ آجائے گی "

ایسا معلوم ہوتا ہو کہ آگے چل کر یہ تجویز نظر انداز کردی گئی اور اس تجربہ کا موقع نہ ملا۔ مگر اس سے بہرحال ان کے اس خیال کا کافی اندازہ ہوتا ہو کہ وہ اُردُو کے ذریعہ سے تعلیم دینا کس قدر ضروری سمجھتے تھے۔ چنانچہ جب یہ بحث آئی کہ کیا وجہ ہو کہ ہندستان کے کالجوں کی تعلیم سے وہ لیاقت حاصل نہیں ہوتی جو انگلستان کے کالجوں کی تعلیم سے ہوتی ہو۔ اس کا جواب سرسید نے یہی دیا کہ وہاں ذریعۂ تعلیم مادری زبان ہو اور یہاں ایک غیر ملک کی زبان کے ذریعہ سے تعلیم دی جاتی ہو جس پر قدرت حاصل کرنے میں بہت مشکل پیش آتی ہو اور اس پر قادر ہونے تک تمام وقت تحصیل علوم و فنون کا گزر جاتا ہو "

اُردُو کی حمایت میں سرسیّد نے کبھی کوتاہی نہیں کی۔ جب کبھی اُردُو پر آنچ آتی دیکھی تو وہ اس کی حمایت کے لئے فوراً کمربستہ ہوگئے۔ ۱۸۶۷ء میں بعض سربرآوردہ ہندوؤں کو تمام سرکاری دفتروں اور عدالتوں اور مدرسوں سے اُردُو زبان اور اُردُو رسم خط کو خارج کرنے اور اس کے بجائے ہندی بھاشا اور ناگری رسم خط رائج کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ دوسرے سال اس غرض کے لئے جابجا کمیٹیاں، مجلسیں اور سبھائیں قائم ہوئیں اور صدر مجلس الہ آباد میں قائم کی گئی اور بابو سرودا پرشاد سنڈیال اس کے سکریٹری بنائے گئے۔ ۱۸۶۹ء میں اس پر بڑی گرما گرم بحثیں ہوئیں۔ اخبار سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ بنارس گزٹ، رسالہ جلسۂ تہذیب لکھنؤ، ایجوکیشن گزٹ، نورالابصار وغیرہ میں دونوں

طرف سے سخت اور پُرجوش مضامین شائع ہوئے اور اچھا خاصا مناظرے کا رنگ پیدا ہوگیا۔ بابو سرودا پرشاد اور سید احمد خاں میں اس موضوع پر مراسلت بھی ہوئی۔

ادھر یہ کھچڑی پک ہی رہی تھی کہ بہار میں بم کا گولہ پھٹا۔ ۸ نومبر ۱۸۷۱ء کو مظفر پور کے سنٹرل کالج کی نئی عمارت کا سنگ بنیاد رکھنے کے لئے مسٹر جی کیمبل لفٹنٹ گورنر بنگال کو مدعو کیا گیا۔ اُن کے آنے پر تین تقریریں ہوئیں۔ مولوی سید امداد علی نے اُردو میں اور ڈاکٹر فیلن اور کیمبل نے انگریزی میں تقریر کی ظاہر ہے کہ سپاس ناموں میں اور اس قسم کی مدحیہ تقریروں میں عربی، فارسی الفاظ کے بغیر چارہ نہیں۔ اس پر لفٹنٹ گورنر نے مولوی سید امداد علی کا شکریہ ادا کرنے کے بعد کہا کہ چونکہ میں اس زبان سے ناواقف ہوں اس لئے تقریر کا بہت کم حصہ سمجھ سکا اور مشکل سے یہ فرق کرسکا کہ ان کی تقریر اُردو زبان میں تھی یا فارسی میں۔ اِس ضمن میں اُنھوں نے یہ بھی کہا کہ اُردو دیسی زبان نہیں اور تعلیم عامہ میں اسے رواج نہیں دیا جاسکتا۔ اس کے بعد اُنھوں نے ۴ دسمبر ۱۸۷۱ء کو ایک عجیب و غریب سرکاری یادداشت شائع کی جو جہالت و تعصب اور بدتمیزی میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ اس کا ایک اقتباس یہاں پیش کیا جاتا ہے

"فارسی زبان کو جو ہندستان کے قدیم حکمرانوں کی زبان تھی ترک کردیا گیا ہے۔ سرکاری زبان کی حیثیت سے میرے ہندستان آنے سے قبل یہ زبان ترک کردی گئی تھی۔ میری ملازمت کے ابتدائی ایام میں اس بات کی پوری کوشش کی گئی کہ سرکاری قوانین میں اس دوغلی زبان کے الفاظ مستعمل نہ ہوں جو فارسی انشاپردازوں کو بہت عزیز تھے۔ میرا خیال تھا کہ یہ زبان

متروک ہو چکی ہو اور ہمیں ایسا کرنے میں کامیابی حاصل ہو گئی ہو لیکن پچھلے دنوں جب مجھے بہار جانے کا اتفاق ہوا تو مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ دوغلی زبان پھل پھول رہی ہے اور ہمارے قوانین میں اس کے الفاظ استعمال ہو رہے ہیں اور مدرسوں میں بھی اس کی تعلیم کا انتظام ہے۔ بہار میں جو زبان میں نے سنی وہ نہایت خراب اور مصنوعی تھی۔ ایسی مصنوعی زبان میں نے کبھی نہیں سنی تھی مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ اس قسم کی زبان کو ہمارے مدارس میں دیسی زبان کہا جاتا ہے۔ مولوی لوگ جو زبان مروجہ زبان کی بجائے ہمارے مدارس میں سکھاتے ہیں وہ زبان کہلانے کی مستحق نہیں۔ اس زبان کے لئے اُردوُ کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے جو نہایت غیر موزوں ہے میں سمجھتا ہوں کہ یہ لفظ بنگال کے محکمہ تعلیمات نے رائج کیا ہے، یہ ایسا لفظ ہے جس کے معنے متعین نہیں کئے جا سکتے۔ کتابوں میں چاہے اس زبان کے متعلق کچھ لکھیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُردوُ زبان اہل دربار اور دلّی کی طوائفوں کی زبان ہے۔ اس کو ملک کی مروجہ زبان نہیں کہہ سکتے۔ میں نے پورا ارادہ کر لیا ہے کہ جہاں تک میرا بس چلے گا اس زبان کی تعلیم کو جو ہمارے مدرسوں میں دی جاتی ہے، روکنے کی کوشش کروں گا۔ میں فارسی زبان کے مداحوں میں ہوں۔ یہ ایک نفیس اور پرتکلّف زبان ہے۔ اگر فارسی زبان کی تعلیم دی جائے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں بشرطیکہ حالات ایسا کرنے کے موافق ہوں لیکن بگڑی عربی اور بگڑی ہوئی فارسی کے میل جول سے جو زبان تیار کی گئی ہے جس میں ہندوستانی کے کچھ تھوڑے سے افعال و حروف ہجائیہ شامل کر لئے گئے ہیں جسے اُردوُ کہتے ہیں، ہرگز اس قابل نہیں کہ اس کی تعلیم دی جائے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مصنوعی زبانیں سکھانے سے کچھ فائدہ نہیں جنھیں عام لوگ نہیں بولتے اور نہ سمجھ سکتے ہیں۔

میں ڈائرکٹر تعلیمات کی توجہ مندرجہ ذیل اُمور کی طرف مبذول کراتا ہوں
(۱) اُردُو زبان ہمارے مدرسوں اور تعلیمی اداروں میں قطعی طور پر متروک ہو چکی ہے۔ (۲) ڈائرکٹر تعلیمات اور انسپکٹرانِ مدارس کو ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ اس بات کو کہ ہمارے مدرسوں میں کوئی ایسی کتاب تو نہیں پڑھائی جاتی جو ملک کی اصلی اور خالص زبان میں نہیں لکھی گئی ہے جس کے متعلق اوپر ذکر کیا جا چکا ہے" وغیرہ وغیرہ آخر میں لکھتے ہیں "میں نے اوپر جو کچھ ہدایات دی ہیں ان کی تعمیل تمام سرکاری عہدہ داروں پر عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنے دفاتر میں سوا مروجہ زبان کے دوسری زبان کا استعمال نہ کریں، اِلّا انگریزی زبان کے۔ انگریزی زبان جن دفاتر میں استعمال ہوتی ہے وہ علیٰ حالہ رہے گی۔ مجھے توقع ہے کہ ہائی کورٹ کے جج میری طرح دیسی زبانوں کے غلط استعمال کے خلاف ہوں گے"۔

یہ شخص اُردُو کو دوغلی زبان کہتا ہے حالانکہ اس کی مادری زبان دُنیا بھر کی زبانوں میں سب سے زیادہ دوغلی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ (یہ میرا قیاس ہے) کہ ڈاکٹر فیلن انسپکٹر مدارس اور اینٹنی میکڈانل نے جو اُس وقت بہار میں کلکٹر تھے لفٹننٹ گورنر کے کان بھرے۔ یہ دونوں ہندی کے حامی تھے۔ ڈاکٹر فیلن نے اپنی ہندُستانی ڈکشنری میں ڈھونڈ ڈھونڈ اور چُن چُن کر اور اپنے گماشتوں کے ذریعہ تلاش کروا کر بڑے اہتمام سے فحش اور سوقیانہ الفاظ اور محاورے جمع کئے ہیں یہی نہیں کہ جو لفظ درحقیقت فحش ہیں وہی لکھے ہوں بلکہ ایسے معمولی روزمرّہ کے لفظ اور محاورے بھی جو مجازاً، کنایۃً، طنزاً یا کسی نہ کسی صورت سے فحش معنوں میں آسکتے ہیں، اُنھوں نے بڑی باریک بینی سے ایسے معنے بھی درج فرما دیئے ہیں۔ مقصد اُردُو کو سوقیانہ زبان ثابت کرنا اور بدنام کرنا تھا۔ دوسرے اینٹنی میکڈانل وہ بزرگ ہیں کہ جب وہ یوپی کے لفٹننٹ گورنر ہو کر آئے تو سب سے

پہلے اُردو پر ہاتھ صاف کیا۔ اُن کے عہد حکومت کا بڑا کارنامہ یہی ہے۔ غرض مسلمانوں اور بعض پرانی وضع کے ہندوؤں نے بہت کچھ واویلا کی مگر شنوائی نہ ہوئی بات یہ ہے کہ مسلمانوں کو منظم طور سے احتجاج کرنا اور ہلچل مچانا نہ پہلے آتا تھا اور نہ اب آتا ہے اس لئے ہمیشہ خسارے میں رہے۔

جب سرسید نے دیکھا کہ بات بڑھتی جارہی ہے اور ہندو اپنی کوششوں میں برابر لگے ہوئے ہیں تو الہ آباد میں ۹ دسمبر ۱۸۶۷ء کو اُردو کی حمایت میں ایک جلسہ ہوا۔ اور ہندی کی تحریک کو روکنے کے لئے ایک صدر کمیٹی الہ آباد میں بنائی گئی جس کے سکریٹری سید احمد خاں قرار پائے۔ صدر کمیٹی کی طرف سے ایک سرکلر صوبہ شمال مغرب کے ہر ضلع میں بھیجنے کے لئے تیار کیا گیا۔ اس سرکلر میں اُن نقصانات کی تفصیل تھی جو اُردو کو خارج کرنے اور اس کے بجائے ہندی کو رائج کرنے سے ہوں گے۔ نیز اس جلسے میں ایک تجویز یہ ہوئی کہ ہر ضلع میں ماتحت کمیٹیاں اس غرض سے بنائی جائیں۔ مسلمانوں کی طرف سے تو اس معاملہ میں کچھ زیادہ جوش خروش کا اظہار نہ ہوا، لیکن الہ آباد کی ہندی صدر مجلس نے منظم طور پر اپنی کوششوں کو شدومد سے جاری رکھا اور ہزارہا ہندوؤں کے دستخطوں سے بڑے بڑے محضر گورنمنٹ میں پیش کئے۔ ڈائرکٹر تعلیمات نے اس کمیٹی کی تائید کی مگر اُس وقت اس بنا پر کچھ کامیابی نہ ہوئی کہ اُردو زبان اور اس کا رسم خط ہندی بھاشا اور دیوناگری رسم خط کی نسبت بہت زیادہ مروّج تھا۔

سرسید نے ۱۸۵۷ء کے بعد جب قومی خدمت شروع کی تو جتنے کام کئے اُن میں کبھی ہندو مسلم کا امتیاز نہ کیا اور نہ کبھی اس کا خیال آیا۔ مثلاً مُراد آباد اور غازی پور میں مدرسے قائم کئے۔ سائنٹفک سوسائٹی قائم کی اور اس قسم کے جو جو کام کئے وہ سب کے لئے تھے اور ان میں ہندو مسلمان دونوں برابر کے

شریک تھے اور ہمیشہ ہندو مسلم اتحاد پر زور دیا۔ انھوں نے اپنی تقریروں میں بار ہا اس خیال کو بڑے خلوص اور پر اثر الفاظ میں بیان کیا۔ یہاں میں صرف دو ایک اقتباس درج کرتا ہوں۔

"اے ہندو اور مسلمانوں! کیا تم ہندستان کے سوا اور ملک کے رہنے والے ہو؟ کیا اسی زمین پر تم دونوں نہیں بستے؟ کیا اسی زمین میں تم دفن نہیں ہوتے یا اسی زمین کے گھاٹ پر جلائے نہیں جاتے؟ اسی پر مرتے اور اسی پر جیتے ہو۔ تو یاد رکھو کہ ہندو اور مسلمان ایک مذہبی لفظ ہے ورنہ ہندو مسلمان اور عیسائی جو اسی ملک میں رہتے ہیں اس اعتبار سے سب ایک ہی قوم ہیں جب یہ سب گروہ ایک قوم کہے جاتے ہیں تو ان سب کو ملکی فائدے میں ان سب کا ملک کہلاتا ہے ایک ہونا چاہئے۔" (تقریر گورداسپور ۲۷ جنوری ۱۸۸۴ء)

"میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو مثل اپنی دو آنکھوں کے سمجھتا ہوں اس کہنے کو بھی میں پسند نہیں کرتا کیوں کہ لوگ علی العموم یہ فرق قرار دیں گے کہ ایک کو دائیں آنکھ اور دوسری کو بائیں آنکھ کہیں گے۔ مگر میں ہندو اور مسلمان دونوں کو بطور ایک آنکھ کے سمجھتا ہوں۔ اے کاش میرے صرف ایک آنکھ ہی ہوتی کہ اس حالت میں میں عمدگی کے ساتھ ان کو اس ایک آنکھ کے ساتھ تشبیہ دے سکتا۔"

"اے میرے دوستو! میں نے بار ہا کہا ہے اور پھر کہتا ہوں کہ ہندستان ایک دلہن کی مانند ہے جس کی خوب صورت اور رسیلی دو آنکھیں ہندو اور مسلمان ہیں۔ اگر وہ دونوں آپس میں نفاق رکھیں گے تو وہ پیاری دلہن بھینگی ہو جائے گی۔ اور اگر ایک دوسرے کو برباد کردیں گے تو وہ کانڑی بن جائیگی پس اے ہندوستان کے رہنے والے ہندو و مسلمانوں اب تم کو اختیار ہے کہ چاہو

اُس دُلہن کو بھینگا بنا ؤ چاہو کانڑا ۔"

"ہندستان میں خدا کے فضل سے دو قومیں اس طرح آباد ہیں کہ ایک کا گھر دوسرے سے ملا ہے۔ ایک کی دیوار کا سایہ دوسرے کے گھر میں پڑتا ہے ایک آب و ہوا میں دونوں شریک ہیں ۔ایک دریا کا پانی پیتے ہیں ۔ مرنے جینے میں ایک دوسرے کے رنج و راحت میں شریک ہوتا ہے۔ ایک کو دوسرے کے بغیر چارہ نہیں پس کسی چیز کو جو معاشرت سے تعلق رکھتی ہے دونوں کا علیحدہ علیحدہ رہنا دونوں کو برباد کر دیتا ہے۔"

"اب ہندوستان ہی ہم دونوں کا وطن ہے۔ ہندستان ہی کی ہوا سے ہم دونوں جیتے ہیں۔ مقدس گنگا جمنا کا پانی دونوں پیتے ہیں ۔ ہندستان ہی کی زمین کی پیداوار ہم دونوں کھاتے ہیں ۔ مرنے جینے میں دونوں کا ساتھ ہے ہندستان میں رہتے رہتے دونوں کا خون بدل گیا ، دونوں کی رنگتیں ایک سی ہوگئیں ، دونوں کی صورتیں بدل کر ایک دوسرے کے مشابہ ہو گئیں مسلمانوں نے ہندوؤں کی سیکڑوں رسمیں اختیار کر لیں ، ہندوؤں نے مسلمانوں کی سیکڑوں عادتیں لے لیں ، یہاں تک ہم دونوں آپس میں ملے کہ ہم دونوں نے مل کر ایک نئی زبان پیدا کر لی جو نہ ہماری زبان تھی نہ اُن کی۔"

"میرے نزدیک یہ امر چنداں لحاظ کے قابل نہیں کہ اُن کا (یعنی ہندو مسلمان کا) مذہبی عقیدہ کیا ہے ، کیونکہ ہم اُس کی کوئی بات نہیں دیکھ سکتے لیکن جو بات کہ ہم دیکھتے ہیں وہ یہ ہے کہ ہم سب خواہ ہندو ہوں یا مسلمان ایک ہی سرزمین پر رہتے ہیں ، ایک ہی حاکم کے زیر حکومت ہیں ، ہم سب کے فائدے کے مخرج ایک ہی ہیں ، ہم سب قحط کی مصیبتوں کو برداشت کرتے ہیں ، یہی مختلف وجوہ ہیں جن کی بنا پر میں ان دونوں قوموں کی جو ہندستان میں آباد

ہیں، ایک لفظ سے تعبیر کرتا ہوں کہ "ہندو" یعنی ہندستان کی رہنے والی قوم"۔
ان اقوال سے ظاہر ہے کہ وہ ہندو مسلم اتحاد کے کس قدر حامی تھے۔ تقریر وتحریر میں کبھی کوئی ایسی بات نہیں کہی جس سے بوئے تعصب آتی ہو یا ہندوؤں کی دل آزاری کا باعث ہو، بلکہ ان کے بزرگوں اور لیڈروں کا ذکر ہمیشہ ادب واحترام سے کیا اور ان کے مرنے پر کمال رنج وافسوس کا اظہار کیا۔ اپنی تقریروں اور مضامین میں بار بار باہمی اتحاد کی تلقین کی اور یہ سمجھایا کہ ہندو مسلمانوں کی بھلائی اسی میں ہے کہ وہ اپنے تئیں ایک قوم سمجھیں اور بھائی بھائی کی طرح مل کر کام کریں۔ گائے کی قربانی کا معاملہ ایسا ہے جس کی وجہ سے ہندستان میں جگہ جگہ دنگے فساد اور خون خرابہ ہوا اور اب تک یہ جھگڑا چلا آرہا ہے۔ مسلمان اسے اپنا مذہبی حق سمجھتے ہیں اور اس میں مداخلت یا ممانعت کو گوارا نہیں کرتے۔ لیکن سرسید نے نہایت صاف دلی اور آزادی سے اپنے مضمون میں یہ خیال ظاہر کیا کہ اگر ہم میں اور ہندوؤں میں دوستی قائم رہے تو یہ دوستی ہمارے لئے گائے کی قربانی سے بہت بہتر ہے اور مسلمانوں کا اس پر اصرار کرنا محض جہالت کی بات ہے۔ یہ صرف خالی خولی زبانی باتیں نہ تھیں بلکہ اس پر ان کا عمل بھی تھا۔ چناں چہ ایک سال بکرید کے موقع پر کالج کے چند طالب علموں نے شریک ہو کر ایک گائے قربانی کے لئے خریدی۔ عین بکرید کے دن نماز عید کے بعد سرسیدؒ کو خبر ہوئی کہ کالج میں گائے کی قربانی ہونے والی ہے۔ یہ سُنکر وہ از خود رفتہ ہوگئے۔ فوراً سوار ہونے کے لئے گاڑی تیار کرائی اور اپنی کوٹھی سے کالج تک آدمیوں کی ایک ڈاک لگا دی، یہاں تک کہ وہ گائے طالب علموں سے چھین کر اُس کے مالک کو واپس کردی گئی اور طالب علموں کو سخت ملامت کی اور آئندہ کے لئے قطعی ممانعت کردی کہ کالج کے احاطے

میں کوئی ایسا نہ کرنے پائے۔ اس سے بڑھ کر صلح جوئی اور آشتی پسندی کیا ہو سکتی ہے۔

لیکن جب ہندوؤں کی طرف سے سرکاری دفتروں اور مدارس سے اردو کے خارج کرنے کی تحریک ہوئی تو سرسیدؔ کے دل کو بڑی ٹھیس لگی اور بہت صدمہ ہوا۔ مولانا حالیؔ لکھتے ہیں کہ سرسیدؔ کہتے تھے کہ یہ پہلا موقع تھا جبکہ مجھے یقین ہو گیا کہ اب ہندو مسلمانوں کو بطور ایک قوم کے ساتھ چلنا اور دونوں کو ملا کر سب کے لئے ساتھ ساتھ کوشش کرنا محال ہے۔ ان کا بیان ہے کہ انھیں دنوں میں جب کہ یہ چرچا بنارس میں پھیلا ایک روز مسٹر شیکسپیر سے جو اُس وقت بنارس میں کمشنر تھے، میں مسلمانوں کی تعلیم کے باب میں کچھ گفتگو کر رہا تھا اور وہ متعجب ہو کر میری گفتگو سن رہے تھے۔ آخر اُنھوں نے کہا کہ آج یہ پہلا موقع ہے کہ میں نے تم سے خاص مسلمانوں کی ترقی کا ذکر سنا ہے۔ اس سے پہلے تم ہمیشہ عام ہندوستانیوں کی بھلائی کا خیال کرتے تھے۔ میں نے کہا اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہو سکیں گی۔ ابھی تو بہت کم ہے آگے آگے اس سے زیادہ مخالفت اور عناد اُن لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں بڑھتا نظر آتا ہے۔ جو زندہ رہے گا وہ دیکھے گا۔ اُنھوں نے کہا کہ اگر آپ کی پیشین گوئی صحیح ہو تو نہایت افسوس ہے۔ میں نے کہا مجھے بھی نہایت افسوس ہے مگر اپنی پیشین گوئی پر مجھے پورا یقین ہے۔"

اپنے اس خیال کو اُنھوں نے علی گڑھ کی تعلیمی سروے رپورٹ میں بھی ایک جگہ ان الفاظ میں ظاہر کیا ہے۔

"تیس برس کے عرصے سے مجھ کو ملک کی ترقی اور اُس کے باشندوں کی فلاح کا خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان خیال پیدا ہوا ہے اور ہمیشہ میری یہ خواہش

تھی کہ دونوں مل کر دونوں کی فلاح کی کوشش کریں۔ مگر جب سے ہندو صاحبان
کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اُردو زبان اور فارسی کو جو مسلمانوں کی حکومت اور ان کی
شاہنشہی ہندستان کی باقی ماندہ نشانی ہے، مٹا دیا جائے اس وقت سے مجھ کو
یقین ہو گیا کہ اب ہندو مسلمان باہم متفق ہو کر ملک کی ترقی اور اُس کے باشندوں
کی فلاح کا کام نہیں کر سکتے۔ میں نہایت درستی اور اپنے تجربہ اور یقین سے
کہہ سکتا ہوں کہ ہندو مسلمانوں میں جو نفاق شروع ہوا ہے اس کی ابتدا اسی
سے ہوئی"۔

اس سے ذرا شبہ نہیں کہ ہندو مسلم نزاع یہیں سے شروع ہوتی ہے
اور دو قومی نظریہ کی ابتدا یہیں سے ہوئی۔ عام طور پر یہ بیان کیا جاتا ہے کہ
ہندو مسلم تنازع سیاسی ہے اور سرسید نے انڈین نیشنل کانگریس کی مخالفت
کرکے اس کی بنیاد ڈالی۔ یہ سراسر غلط ہے۔ اُس کی بنیاد اُس وقت پڑی جب
ہندوؤں نے اُردو کو مٹانے کی کوشش کی، اور یہ کوشش برابر جاری رہی۔
چناں چہ جب سر انٹونی میکڈانل جو بہار میں گل کھلا چکے تھے یو۔ پی کے لفٹننٹ
گورنر ہو کر آئے تو ہندی والوں کی بن آئی اور باسی کڑھی میں پھر اُبال آیا۔ اس
واقعہ کو مولانا حالی نے حیات جاوید میں بیان کیا ہے۔ یہاں میں اُنھیں کے
الفاظ نقل کرتا ہوں۔

" مارچ ۱۸۹۸ء میں جس کی ستائیسویں کو سرسیّد نے دنیا سے رحلت
کی، سر انٹونی میکڈانل لفٹننٹ گورنر اضلاع شمال مغرب و اودھ کی خدمت
میں دونوں صوبوں کے بڑے بڑے معزز اور سر برآوردہ ہندوؤں نے پھر ایک
میموریل اس غرض سے گزرانا کہ تمام سرکاری عدالتوں اور کچہری میں بجائے
اُردو زبان اور فارسی رسم خط کے ہندی بھاشا اور ناگری خط جاری کیا جائے۔

اگرچہ سرسید پر اس زمانے میں ہجوم رنج والم کے سبب ایسا سکتے کا سا عالم طاری تھا کہ وہ بالکل نقش دیوار بن گئے تھے مگر اسی حالت میں انھوں نے اس مضمون پر آرٹیکل لکھا جو ۱۹ مارچ کے انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں سرسید کی وفات سے نو دن پہلے شائع ہوا اور جو کمیٹی مسلمانوں نے الہ آباد میں اُردو کی حمایت کے لئے قائم کی تھی اس کو اس باب میں بذریعہ تحریر کے کچھ مشورے دیئے اور لکھا کہ اگرچہ مجھ سے اب کچھ نہیں ہو سکتا لیکن جہاں تک ممکن ہوگا میں ہر قسم کی مدد دینے کو موجود ہوں۔ ان کو یقین ہو گیا تھا کہ ہندوؤں کا یہ کام درحقیقت محض قومی تعصب پر مبنی ہے، اس لئے وہ اپنے ہندو دوستوں کی ناراضی کی مطلق پروا نہیں کرتے تھے جس طرح وہ ہندوستان کے انگریزی لباس اور انگریزی طرز معاشرت پر انگریزوں کے اعتراضات کو ہمیشہ ان کی تنگ دلی اور غرور پر محمول کرتے تھے اور کبھی اُن کے اعتراضوں کا جواب دینے سے نہ چوکتے تھے۔ اسی طرح انھوں نے اُردو کی مخالفت پر کبھی سکوت اختیار نہیں کیا۔ یہاں تک کہ مرتے مرتے بھی وہ اس ڈیوٹی کو بھی ادا کئے بغیر نہ رہے۔ وہ اپنے آرٹیکل کے شروع میں لکھتے ہیں کہ "غالباً اس وقت اُن کے (یعنی ہندوؤں کے) اس جوش کے اُٹھنے کا سبب یہ ہے کہ اس صوبے کے لفٹنٹ گورنر بہادر اُس زمانے میں جب کہ صوبۂ بہار میں کیتھی حرف اور بہاری زبان بہ عوض اُردو زبان اور فارسی خط کے جاری ہوئی تھی، کلکٹر اور مجسٹریٹ معاون اس تجویز کے تھے پس ان صوبوں میں بھی ہندی ناگری حروف جاری ہونے میں تامل نہ فرمائیں گے۔ اور شاید یہ غلط خیال بھی اُسی پُرانے مردہ مضمون کے اُٹھانے کا باعث ہوا ہو کہ ان دنوں میں گورنمنٹ کی نظر عنایت مسلمانوں کی نسبت کم ہے اور وہ اُن کو ناشکرا سمجھتی ہے۔" اس کے بعد انھوں نے میموریل کے خلاف اُردو زبان اور فارسی خط کی ترجیح کی دلیلیں پیش کی ہیں۔

اگرچہ اس وقت ہز آنر نے کورٹ کی زبان میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں سمجھی تھی مگر جو کچھ اُنھوں نے میموریل کے جواب میں فرمایا اُس سے صاف پایا جاتا تھا کہ آئندہ ایسی تبدیلی ہونی ممکن ہو۔ چنانچہ سرسید کے انتقال کے بعد ۱۸ اپریل ۱۹۰۰ء کو وہ مشہور ریزولیوشن پاس ہوا جو دونوں قوموں کو سر اینٹنی میکڈانل کا عہدِ حکومت ہمیشہ یاد دلائے گا۔"

یہ صرف میکڈانل کے عہدِ جبروت مہد ہی کو نہیں یاد دلاتا بلکہ اس نے ہندوؤں کے دو قومی نظریہ پر بھی مہر ثبت کر دی۔ ڈیپوٹیشن کو جواب دیتے ہوئے مد ہز آنر نے موجودہ دستورِ عدالت میں جلد تبادلے کو ناپسند کر کے جس کے افسران گورنمنٹ عادی نہیں ہیں قبول کیا کہ سرکاری کاغذات میں ناگری حروف کے مزید استعمال سے فائدہ حاصل ہو سکتا ہو۔" مطلب صاف ظاہر ہو کہ گھبراؤ نہیں، ذرا جابت باز ہو۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہو مختصر یہ کہ نیرنگی تقدیر سے جو اس کی جان کے لاگو تھے وہی اس کے آقا بن گئے اور اُنھوں نے اس کے ساتھ وہی سلوک کیا جو کسی زمانے میں بدھ مت والوں اور ان کی زبان پالی کے ساتھ کیا تھا۔ یہ ان کے لئے کوئی نئی بات نہیں سنّت قدیم ہو۔

سرسیدؔ اُردو کی حمایت کو اپنا بہت بڑا فرض اور ایک اہم قومی خدمت سمجھتے تھے اور اس معاملے میں اُنھوں نے کبھی کوتاہی نہ کی بلکہ سب سے پہلے قدم آگے بڑھایا۔ لیکن علمی و ادبی اعتبار سے بھی اُردو زبان میں ان کا بہت بڑا درجہ ہو۔ ان کا ذوقِ ادب ایسا اچھا تھا کہ اگر وہ دوسرے بکھیڑوں میں نہ پڑتے تو اُردو کے بہت بڑے ادیب ہوتے۔ اب بھی اگر ان کی ضخیم تصانیف اور بے شمار تحریروں میں سے صرف اَدبی نقطۂ نظر سے ایک انتخاب کیا جائے تو یہ انتخاب

ہماری زبان وادب کا بے مثل شاہکار ہوگا۔ یہ ادبی ذوق ہی تو تھا جس نے قیام سائنٹفک سوسائٹی کے بعد انھیں اُردو لغات اور اُردو کی تاریخ لکھنے پر آمادہ کیا۔ ان کی تحریروں میں تو اکثر جگہ ادبی جواہر ریزے اور حسن بیان کے چمکارے ، ٹھیٹ زبان کے الفاظ اور محاورے اور مزاح وظرافت کی پھلجھڑیاں نظر آئیں گی ، لیکن جب کبھی اپنے روزمرہ کے اشغال وافکار سے فارغ ہوتے خصوصاً رات کے کھانے کے بعد کوئی علمی یا ادبی گفتگو آ جاتی تو اس میں بھی بعض اوقات کوئی نکتے کی بات کہہ جاتے تھے۔ ایک دن مولانا شبلی نے قرآن مجید کا کوئی لفظ یا جملہ (افسوس اس وقت مجھے بالکل یاد نہیں رہا) پڑھا اور کہا کہ شاہ عبدالقادرؒ نے اس کا کیا اچھا ترجمہ کیا ہو "اور بات تو یہ ہے"۔ سیّد صاحب نے فرمایا اس سے بھی مختصر اور بہتر ہو سکتا ہے۔ مولانا نے پوچھا وہ کیونکر فرمایا "اور ہو تو یہ" مولانا قائل ہو گئے۔ ایک بار ظفر اور ذوق پر گفتگو چھڑ گئی اور وہی پُرانی بحث دہرائی گئی کہ ظفؔر کے سب دیوان ذوق کے لکھے ہوئے ہیں سیّد صاحب اس پر ذرا چیں بہ جبیں ہوئے اور فرمایا کہ بادشاہ کا کلام تو کیا لکھنا قلعہ کے تعلّق سے خود ذوق کو زبان آگئی۔

مولوی عبدالرزاق (مصنّف البرامکہ) اپنی کتاب "یادِ ایّام" میں لکھتے ہیں "سر سیّد کی صحبت نہایت دلچسپ ہوتی تھی شب کے کھانے پر نہایت اطمینان سے گفتگو ہوا کرتی تھی۔ ...... مولانا شبلی اکثر کھانے پر تاریخی واقعات اور سلاطین مغلیہ وغیرہ کے حالات دریافت کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ مولانا نے داغؔ کا ایک شعر پڑھا جس میں سلاطین کی جمع سلاطینوں آئی تھی۔ اس پر میرے دوست نے داغؔ کا مضحکہ اُڑایا۔ سر سیّد سُن کر چپ ہو رہے جب دوبارہ یہ بحث شروع ہوئی تو فرمایا سلطان کی جمع عربی میں سلاطین آتی ہے

لیکن اس شعر میں سلاطین سے (قلعۂ معلّٰی کی اصلاح کے مطابق) دوسرے معنے مراد ہیں۔ تب مولانا نے عرض کیا کہ تفصیل سے ارشاد فرمایئے، میری سمجھ میں نہیں آیا۔ سید صاحب نے فرمایا کہ ولی عہد کے علاوہ جس قدر تیموری شہزادے قلعۂ معلّٰی میں تھے ان میں سے ہر ایک کا لقب سلاطین تھا۔ اس سبب سے سلاطین کی جمع سلاطینوں صحیح ہو۔ داغ نے قلعۂ معلّٰی میں عہد طفلی سے جوانی تک تعلیم و تربیت پائی تھی، لہذا اس کا کلام مستند ہو۔"

سرسیّد بلا کے کام کرنے والے تھے۔ تصنیف و تالیف کا کام بھی کرتے تھے۔ اخبار اور تہذیب الاخلاق کے لئے مضامین بھی لکھتے تھے۔ معترضین کے جواب بھی دیتے تھے۔ کالج کے حساب کتاب اور دوسرے اہم کاموں اور عمارتوں کی نگرانی بھی کرتے تھے۔ رپورٹیں تیار کرتے اور ایڈریس لکھتے لیجس لیٹو کونسل کی ممبری کے زمانے میں تقریریں تیار کرتے۔ خطوں کے جواب لکھتے یا لکھواتے ملاقاتیوں سے ملتے۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور دوسرے جلسوں کا انتظام کرتے کس کس کام کا ذکر کیا جائے۔ کاموں کا ایک ہجوم تھا جسے وہ استقلال اور اطمینان سے صبح سے لیکر شام تک برابر کرتے رہتے تھے۔ بڑھاپے کے زمانے میں بھی ان کے انہماک اور محنت کا یہی حال تھا۔ حقیقت یہ ہو کہ کام اور محنت کرنے ہی سے انسان بنتا ہو اور اسی سے اس کی سیرت بنتی ہو اور اسی سے اس کے دماغی اور اخلاقی قوا کی جلا ہوتی ہے۔ اس سے مراد وہ کام ہو جس کے کرنے میں انسان کو لذّت ملے اور شوق اُسے اور اُکھارے ورنہ کام کام نہیں رہتا بیگار ہو جاتی ہے۔ سرسیّد کا یہی حال تھا کہ وہ بڑے سے بڑا اور چھوٹے سے چھوٹا کام ایسے شوق اور تن دہی سے کرتے تھے گویا ان کی دُنیا اور عاقبت کا انحصار اسی پر ہو۔ ہمیں بہت سے

بڑے بڑے لوگوں کے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے لیکن سیّد کی شان ہی کچھ اور تھی
ان کا دروازہ سب کے لئے کھلا تھا۔ ملاقاتیوں سے باتیں بھی کر رہے ہیں۔ جمع
خرچ کی جانچ بھی ہو رہی ہے، علمی کام بھی ساتھ ساتھ ہو رہا ہے۔ بجٹ بھی مرتب کیا
جا رہا ہے، خط بھی لکھے یا لکھوائے جا رہے ہیں ہنسی چہل کی باتیں بھی ہو رہی ہیں، پروف
بھی پڑھ رہے ہیں مضمون بھی لکھوا رہے ہیں۔ یہ سب کچھ ہوتا ہے لیکن پیشانی
پر میل نہیں آتا، ایک بات پر مجھے بڑی حیرت تھی۔ گورنمنٹ آف انڈیا نے انھیں
لیجس لیٹو کونسل کا ممبر انتخاب کیا تھا۔ کونسل میں تمام تقریریں انگریزی میں
ہوتی تھیں اور یہ انگریزی نہیں جانتے تھے۔ یہ بات تو سمجھ میں آتی تھی کہ کونسل
کے معاملات کے تمام کاغذات جو سراسر انگریزی میں ہوتے تھے پڑھوا کر اور
ترجمہ کروا کر سنتے اور ان کے متعلق ضروری معلومات حاصل کرتے لیکن یہ بات
سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ وہ کونسل میں جا کر انگریزی میں تقریر کیوں کر کرتے تھے۔ اس
کی انھوں نے عجیب ترکیب نکالی تھی پہلے وہ اپنی تقریر اُردو میں لکھتے اس
کے بعد اس کا ترجمہ انگریزی زبان میں کراتے، پھر اس انگریزی تقریر کو اُردو
حروف میں لکھتے اور کونسل میں جا کر پڑھ دیتے۔ یہ کام ایسا بے مزہ اور
اُکتا دینے والا تھا کہ ان کی جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو کبھی کا بھاگ کھڑا ہوتا لیکن
وہ اس سے مطلق نہ گھبراتے، لطف یہ ہے کہ یہ تقریریں معمولی اور وقت گزارنے
کے لئے نہیں تھیں۔ ان میں بعض بڑے معرکہ کی تھیں۔ ایک بار جب کونسل کے
اجلاس کے ختم پر وہ اپنے کمرے کی طرف جا رہے تھے تو لارڈ لیٹن اُن کے پیچھے
پیچھے چلے آئے اور اُن کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگے کہ میں نے ایسی قابلانہ
اسپیچ کبھی نہیں سُنی تھی“۔

قومی خدمت میں منہمک ہونے سے قبل بھی ان کا یہی حال تھا، اُن کی

اخلاقی جرأت آزادیٔ خیال، رواداری، انصاف پسندی، بے تعصبی، فیاضی اور ہمدردی کے ہندو مسلمان سب قائل تھے۔ جس کام کو انھوں نے اپنے ہاتھ میں لے لیا اُسے کامل خلوص اور تن دہی سے انجام دیا۔ جب قومی خدمت کا بار اپنے سر لیا تو یہ شغف اور بڑھ گیا۔ اس دھن میں وہ سب کچھ بھول گئے۔ فرہاد کو شیریں سے اور نل کو دمن سے اتنا عشق نہ ہوگا جتنا انھیں اپنی قوم سے تھا۔ سوتے جاگتے اُٹھتے بیٹھتے یہی ان کا ورد تھا۔ وہ بلا مبالغہ فنا فی القوم کے درجے کو پہنچ گئے تھے۔ سیّد نے قوم کا مفہوم ہی بدل دیا۔ اس سے پہلے قوم سے مراد سیّد، شیخ، مغل، پٹھان تھی۔ سیّد نے اسے "نیشن" کا ہم معنی بنایا اور مسلمانوں میں قومیت کا تصوّر پیدا کیا۔

شروع میں ایک مدّت تک وہ ہندُستان کے تمام باشندوں کو ایک قوم کہتے اور سمجھتے تھے جس کا اظہار انھوں نے بار بار اپنی تقریروں اور تحریروں میں کیا ہے۔ لیکن جب ہمارے ہندو بھائیوں نے اُردو کی مخالفت کر کے دو قومی نظریے کی بنیاد ڈالی تو انھیں سخت رنج ہوا اور انھوں نے ناچار اپنی کوششوں کا رُخ مسلمانوں کی فلاح و تعلیم کی طرف پھیر دیا۔ یہیں سے ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہوگئیں۔ ہندو سماج کا عمل دو قومی کیا صد قومی نظریے پر ہے۔ میرے مرحوم دوست سیٹھ یعقوب حسن جو کانگریس کے اوّل درجے کے پرستاروں اور لیڈروں میں سے تھے مجھ سے بیان کرتے تھے کہ جب یہ معلوم ہوا کہ مسٹر گوکھلے مدراس تشریف لانے والے ہیں تو میں نے انھیں ایک بڑے ہوٹل میں ڈنر دینے کی سوچی، اور اس تجویز کو اپنے احباب کے سامنے پیش کیا۔ وہ کہتے تھے کہ سب سے زیادہ مشکل مجھے ہندو احباب کو رضامند کرنے میں پیش آئی۔ جب میں نے اُن سے اس کا تذکرہ کیا تو وہ

حیرت سے میرا منہ تکتے تھے کہ یہ کیونکر ممکن ہو کہ سب ایک میز پر ایک ساتھ کھانا
کھائیں۔ میں نے ان کو اطمینان دلایا کہ کھانے میں گوشت یا کوئی ایسی چیز نہ
ہوگی جس سے ہندوؤں کو پرہیز ہے۔ پکانے والے بھی ایسے ہوں گے جن کے
ہاتھ کے پکائے ہوئے کھانوں کے کھانے میں کسی ہندو کو عذر نہ ہوگا۔ غرض بار
بار کے سمجھانے بجھانے اور بحث و تکرار کے بعد کچھ تو رضامند ہو گئے اور کچھ
نے یہ کہا کہ کھانے کے وقت ہم باہر بیٹھے رہیں گے اور جب کھانا ختم ہو جائیگا
تو اندر آجائیں گے۔ وہ اسی کو غنیمت سمجھے۔ خیر سے یہ سب اعلیٰ تعلیم یافتہ اور
روشن خیال اصحاب تھے۔ مرحوم کہتے تھے کہ جب ڈنر کا دن آیا تو جگہ جگہ سے
ٹیلیفون آئے کہ ڈنر کے وقت کیسے کپڑے پہنیں اور کیا کیا پہنیں۔ میں ایک ایک
کو سمجھاتا اور بتاتا تھا مگر بعض اس پر بھی نہ سمجھے تو میں نے ان کے گھر جا جا کر اپنے
ہاتھ سے کپڑے پہنائے۔ اب ڈنر شروع ہوا۔ ایک گروہ باہر بیٹھا ہوا انتظار
کرتا رہا۔ ڈنر ختم ہوتے ہی یہ مقدس جماعت دبے پانو ہال میں براجمان ہوئی
لیکن کم بختی نے یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ ابھی بیٹھنے ہی پائے تھے کہ اتنے میں آئس کریم
آئی اور ہر ایک کے سامنے رکھی گئی۔ یہ حضرات بہت جز بز ہوئے اور ایک دوسرے
کا منہ تکنے لگے۔ کچھ کھس پھس بھی ہوئی۔ بہت برے پھنسے، نہ پائے رفتن نہ جائے
ماندن۔ بعض نے شرما شرمی دو ایک چمچے زہر مار کی۔ باقیوں نے چھوئی
تک نہیں اور آنکھیں نیچی کئے بیٹھے رہے۔ اب انھیں کون قوم کہہ سکتا ہے؟ یا کوئی
دوسری جماعت ان سے مل کر قوم بننے کا شرف کیوں کر حاصل کر سکتی ہے؟ یہ دوسروں
کو مٹا دینا یا ہضم کرنا جانتے ہیں۔ بیچ کا کوئی رستہ ان کے ہاں نہیں ہے۔

سرسیدؔ نے ہندو مسلم اتحاد قائم رکھنے اور مل کر کام کرنے کی کوشش کی مگر وہ
ناکام رہے۔ اس کے بعد بھی مسلم لیڈروں نے اس خیال کو ترک نہیں کیا اور کانگ

خلوص اور رواداری سے انڈین نیشنل کانگریس کا ساتھ دیتے رہے لیکن آخر ہندوؤں کی نارواداری اور تنگ نظری سے تنگ آکر یکے بعد دیگرے سب الگ ہوگئے۔ اور ان کو بھی وہی کہنا پڑا جو سیّد نے مجبور ہو کر کہا تھا۔ یہ ہندستان کی تاریخ میں نہایت المناک سانحہ ہے اور نارواداری، سیاسی نادار ی اور کوتہ اندیشی کا سب سے بڑا واقعہ۔

دلّی میں سرسیّد کا خاندان بہت شریف اور عالی خاندان تھا۔ اس میں وہ تمام خوبیاں تھیں جو ایک شریف انسان میں ہونی چاہئیں۔ گھر میں ان کی تربیت والدہ کی زیر نگرانی ہوئی اور یہ ایسی تھی جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ اسلامی اخلاق اور تہذیب کے جو نکتے اُس فرزانہ اور نیک بیوی نے اپنے عمل اور قول سے ان کے دل میں بٹھا دیئے تھے وہ عمر بھر نہ بھولے، اور اُن پر عامل رہے۔ بڑے ہو کر جو صحبت ملی وہ اُس زمانے کے بہترین افراد تھے ان میں سے ہر ایک جوہر قابل تھا۔ ان کے نام اب تک ہمارے ادب میں عزت سے لئے جاتے ہیں۔ اگرچہ اُن کی تعلیم اعلا درجے کی نہیں ہوئی تھی لیکن تربیت اور صحبت بڑی چیز ہے۔ علم سے لگاؤ تھا۔ اہل علم اور ارباب سخن کی صحبت نے صحیح ذوق پیدا کیا۔ مطالعہ کا شوق پہلے سے تھا۔ غور و فکر اور نکتہ رسی کا ملکہ قدرت نے ودیعت کیا تھا۔ ان سب کے بل پر انھوں نے وہ وہ کام کئے جو رہتی دنیا تک یادگار رہیں گے۔

سرسیّد کے خاندان کا تعلّق قلعہ سے ایک زمانے سے چلا آرہا تھا قلعے سے جو تنخواہیں ان کے والد کو ملتی تھیں اُن سے اچھی خاصی بسر اوقات ہو جاتی تھی لیکن حالات بدل گئے تھے۔ ان تنخواہوں میں کتر بیونت شروع ہوئی، اس لئے اُن کو قلعہ سے قطع تعلّق کرنا پڑا۔ اور سرکار انگریزی کی ملازمت اختیار کرنی پڑی

اس وقت ان کی عمر تقریباً بائیس سال کی تھی۔ ابتدا میں انھیں معمولی خدمت ملی لیکن وہ اپنی لیاقت اور محنت سے برابر ترقی کرتے چلے گئے اور گورنمنٹ اور پبلک دونوں میں نام پایا۔ لکھنے پڑھنے کا شوق ابتدا سے تھا ملازمت کے زمانے میں بھی یہ سلسلہ برابر جاری رہا اور حقیقت یہ ہے کہ ان کی اکثر تصانیف اور تحریکیں اسی زمانے کی ہیں۔ اب کام اتنے پھیل گئے تھے کہ ان کے لئے بہت فرصت درکار تھی۔ دوسرے سرکاری ملازمت کی وجہ سے بعض کاموں کی انجام دہی میں احتیاط برتنی پڑتی تھی۔ لہٰذا ۱۸۷۶ء میں پنشن پر خدمت سے سبکدوشی حاصل کرلی۔ اور اس عظیم الشان قومی خدمت میں لگ گئے جس کی دھن ان کے دل و دماغ میں سمائی ہوئی تھی۔

شروع شروع میں جب مدرسۃ العلوم قائم ہوا اور لڑکے جماعتوں میں داخل ہوئے تو سید صاحب کا یہ معمول تھا کہ جب صبح کو کالج کی عمارت باغ وغیرہ دیکھنے کو جاتے تو بچوں کے کمروں میں بھی پہنچتے۔ ان سے باتیں کرتے، پڑھنے لکھنے کا حال دریافت فرماتے۔ مزاح بھی کرتے اور کبھی کبھی ڈانٹ بھی دیتے تھے۔ وہ ان کے اکثر بزرگوں سے واقف تھے اور بہت شفقت فرماتے۔ لڑکے جب انھیں آتا دیکھتے تو سنبھل کے بیٹھ جاتے یا کوئی کتاب پڑھنے لگتے۔ کبھی کبھی وہ یونین کلب میں ڈی بیٹ (مباحثہ) کے روز بھی آتے اور کسی ایک پارٹی کی طرف سے تقریر کرتے۔ ایسا دن خوش قسمتی سے شاذ ہی آتا تھا۔ جو طالب علم اچھی تقریر کرتے یا علمی و ادبی ذوق رکھتے اُن سے بہت خوش ہوتے تھے۔ ان میں سے بعض سے وہ علمی کام بھی لیتے۔

سر سید نے مسلمانوں کو ذلت و تباہی کے بھنور سے نکالنے کا ایک ہی علاج سوچا تھا۔ یعنی مسلمانوں میں جدید تعلیم کی ترویج۔ ایک بار فیصلہ کرنے کے

بعد اُسے عمل میں لانے کے لئے طرح طرح کے جتن کئے، کیسی کیسی مخالفتیں اور صعوبتیں برداشت کیں، طعن تشنیع، لعنت ملامت سہی اور کیسی کیسی کچھ کھکھیڑیں نہ اٹھائیں، لیکن نہایت استقلال اور عالی حوصلگی سے اپنے خیال پر جمے رہے اور جو سوچا تھا اسے کر کے چھوڑا۔ مگر آخر آخر میں وہ اس کے نتائج سے مطمئن نہ تھے۔ چنانچہ آخر بار جب وہ ۱۸۹۴ء میں پنجاب گئے اور اہل پنجاب نے بہ مقام جالندھر انھیں اڈریس دیا تو اس کے جواب میں اُنھوں نے صاف صاف کہا کہ ”یونی ورسٹیوں کی مثال اور ہمارے کالج کے لڑکوں کی مثال آقا اور غلام کی سی ہے۔ ہم یونی ورسٹی کے تابع ہیں اور اسی کے ہاتھ بکے ہوتے ہیں۔ جو ٹکڑا علم کا دیتی ہے اُسی کو کھا کر پیٹ بھر لیتے ہیں اور اسی پر قناعت کرتے ہیں۔ اے دوستو ہماری پوری پوری تعلیم اُسی وقت ہوگی جب ہماری تعلیم ہمارے ہاتھ میں ہوگی۔ یونی ورسٹیوں کی غلامی سے آزادی ہوگی ہم آپ اپنی تعلیم کے مالک ہوں گے۔ بغیر یونی ورسٹیوں کی غلامی کے ہم آپ اپنی قوم میں تعلیم پھیلائیں گے۔ فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا اور نیچرل سائنس بائیں ہاتھ میں اور کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا تاج سر پر۔ یونی ورسٹی کی تعلیم ہمیں صرف خچر بناتی ہے۔ اے دوستو میں خود بھی انھیں میں ہوں کیونکہ مجھے بھی ایک یونی ورسٹی نے ایل۔ ایل۔ ڈی کی ڈگری دی ہے۔ ہم آدمی جبھی ہوں گے جب تعلیم ہمارے ہاتھ میں ہوگی۔“ یہ ایسی سچی بات ہے کہ جس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ ابتدا میں ان کا ارادہ یونی ورسٹی ہی قائم کرنے کا تھا لیکن حکومت وقت نے اُس کی تائید نہ کی۔ اُس زمانے میں یونی ورسٹی تو کیا ایک اچھا کالج بھی حکومت کی تائید بغیر چلانا محال تھا۔ ان کی وفات کے بعد وہ کالج جسے اُنھوں نے اپنے خون سے سینچا تھا

یونی ورسٹی تو بن گیا مگر ان کا منشاء پورا نہ ہوا۔ اب تو اس کی توقع خیالِ خام سے زیادہ نہیں۔ لیکن اس کالج نے جو نئی بیداری اور قومی جذبہ پیدا کیا اُسے ہم کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔

انسان کی اصلی فضیلت اور برتری اس کے اخلاق میں ہے۔ افراد ہوں یا اقوام، اخلاق کے زوال میں ان کا زوال اور اخلاق کی پابندی اور استواری میں ان کی عظمت و وقعت ہے۔ سرسیدؔ کی کامیابی کا راز ان کے اخلاق حمیدہ میں تھا۔ اخلاق سے صرف یہی مراد نہیں ہے کہ آدمی دوسروں سے خندہ پیشانی سے پیش آئے، خاطر مدارات کرے۔ وقت پر کسی حاجتمند کی حاجت روا کر دے، زبان و قلم سے ہمدردی کا اظہار کرے۔ یا جیسا کہ اکثر تعریف کے طور پر کہا جاتا ہے "مرنج و مرنجان ہو"۔ اخلاق کی حدود اس سے بہت آگے تک ہیں، عزم و استقلال، ضبط و تحمل، جرأت (خصوصاً اخلاقی جرأت) کام کی لگن، فرض شناسی، دیانت، صداقت، رواداری، انصاف ہمدردی، ایثار، انسان کے اصل جوہر ہیں۔ ان سب میں ایثار کا درجہ سب سے اعلیٰ ہے۔ یعنی ذاتی اغراض پر قومی مفاد کو ترجیح دے۔ اپنے بھائیوں کے دُکھ درد کو اپنا درد دُکھ سمجھے۔ انتہا یہ کہ اپنے آپ کو بھول جائے۔ انسانیت اسی سے عبارت ہے۔

می تواں قطبِ زماں شد می تواں شد غوثِ وقت
ہر چہ خواہی می توانی شد بہ جز انساں شدن!

چیست انسانی تپیدن از تپِ ہمسائیگاں
از سمومِ نجد در باغِ عدن پژماں شدن

خوار دیدن خویش از خواریٔ ابنائے جنس
در شبستانِ تنگ دل از محنتِ زنداں شدن

اخلاق کچھ تو انسان کو فطرتی طور پر ارثاً ملتے ہیں اور کچھ تعلیم اور صالح ماحول اور صحبت سے میسّر آتے ہیں۔ لیکن اس جدید دور اور جدید تہذیب میں تعلیم تعلیم نہیں رہی۔ ہماری تعلیم گاہیں دُکانیں ہیں جن میں درساوری کی خرید و فروخت ہوتی ہے۔ یا ایک قسم کے کارخانے ہیں جن میں فرمائشی مال تیار ہوتا ہے۔ ہمارے اسکولوں اور کالجوں میں جو تعلیم دی جاتی ہے اس کی رسائی زیادہ سے زیادہ حافظے اور ذہن تک ہوتی ہے۔ اخلاق صرف و نحو، منطق یا ریاضیات و تاریخ کی طرح نہیں رٹائے جا سکتے۔ رہا صالح ماحول اور صحبت تو وہ سرے سے ناپید ہیں۔ اب ایک صورت ہے کہ ان بزرگ اور اولوالعزم ہستیوں کے سوانح حیات اور کارنامے لکھنے، پڑھنے اور پڑھانے کا شوق پیدا کیا جائے جنھوں نے اپنی قوم یا ملک یا بنی نوع انسان کی بھلائی کے لئے طرح طرح کی آفتیں اور مصیبتیں اور دُکھ سہے اور اپنے ایسے نقش چھوڑ گئے جو آنے والوں کے لئے ہمیشہ ہدایت و رہنمائی کا کام دیں گے۔ اُن کی قربانیوں، صبر و استقلال اور بے نفسی کے ذکر اذکار سننے اور پڑھنے والوں کے دلوں پر کچھ نہ کچھ اثر کئے بغیر نہیں رہیں گے۔

سر سید کی ہستی بھی ایسی ہی تھی۔ ان کی زندگی سے ہمیں بہت سے بے بہا سبق مل سکتے ہیں۔ ان کا اپنا نصب العین پر آخر دم تک جمے رہنا، اس کے لئے ہر جائز ذریعہ کو کام میں لانا، مخالف قوتوں کا دلیری سے مقابلہ کرنا محنت و مشقت سے کبھی جی نہ چرانا۔ دن رات کام میں لگے رہنا، تساہل اور کاہلی کو پاس نہ پھٹکنے دینا خود ایک بڑا کارنامہ ہے۔ اُنھوں نے اپنے خیالات کو کبھی نہیں چھپایا۔ جو دل میں تھا وہی اُن کی زبان اور قلم پر تھا کبھی اس کی پروا نہیں کی کہ اس سے ان کی ذات یا اُن کے مقصد کو نقصان

پہنچے گا۔ اُن کی زندگی میں اکثر ایسے موقعے آئے جب اُن کے خیر اندیش اور مخلص دوستوں نے ان کو کسی فعل سے باز رہنے کی صلاح دی اور دنیاوی اعتبار سے معاملے کی اونچ نیچ سمجھائی لیکن اُنھوں نے وہی کیا جو ان کے ضمیر نے کہا اور ہمیشہ کمال اخلاقی جرأت سے کام لیا۔ بے ریائی اور صداقت عمر بھر ان کا شعار رہا۔

سرسیّد بڑے فیاض اور سیر چشم تھے غریبوں اور مستحقوں اور مفلوک الحال شرفا کی ہمیشہ مدد کی اکثر اس طرح دیتے تھے جس پر یہ قول صادق آتا ہے کہ دہنے ہاتھ سے یوں دے کہ بائیں ہاتھ کو خبر نہ ہو۔ نیک اور ثواب کے کاموں میں مسجدوں کی تعمیر میں بھی اُنھوں نے بڑی فراخ دلی سے روپیہ صرف کیا۔ غدر کے بعد خانماں برباد پریشان حال مسلمانوں کی طرح طرح دستگیری کی خصوصاً ان بے گناہ مسلمانوں کے لیے جن پر بغاوت کے الزام لگا کر سخت سزائیں تجویز کی گئی تھیں، بہت جد وجہد کی تحقیقاتیں کرائیں، ثبوت بہم پہنچائے اور الزام سے بری کرایا۔ ان فیاضیوں کی بدولت آمدنی سے ان کا خرچ زیادہ رہا اور تنگ دست رہے۔ لیکن جب کالج کی دُھن ان کے سر پر سوار ہوئی تو شخصی فیاضی اور بذل وسخا سے ایک دم ہاتھ اُٹھا لیا۔ اب جو کچھ تھا کالج کے لئے اپنا تو خیر جو کچھ تھا وہ سب کالج کو پوج دیا، مگر مشکل یہ تھی کہ دوسروں کی جیبوں پر بھی اُن کی بڑی کڑی نظر تھی۔ چندہ لینے کے کیسے کیسے نئے ڈھنگ نکالے تھے۔ کسی موقع پر چوکتے ہی نہ تھے۔ علی گڑھ کی نمائش میں کتابوں کی دُکان لگائی اور خود دُکان پر بیٹھ کر کتابیں بیچیں۔ کسی کے بیٹا پوتا پیدا ہوا یہ چراغی مانگنے کے لئے موجود۔ کہیں سیادت کے دعوے سے امام ضامن کا روپیہ مانگنے کے لئے جا پہنچے۔ کسی نے دعوت کی تو دعوت کے بدلے روپیہ وصول کر لیا۔ نشتل والنیبر

بن کر گلے میں جھولی ڈالی۔ اور انتہا یہ ہے کہ ڈراما گر کے اسٹیج پر آتے اور غزلیں گائیں کبھی اس کا خیال نہ کیا کہ لوگ کیا کہیں گے۔ اس چندے سے دوست آشناؤں کی جان عذاب میں تھی۔ خدا ان کی مغفرت کرے وہ یہ بدعت اپنے پیچھے ایسی چھوڑ گئے ہیں کہ آج تک اس سے نجات نہیں ملی۔ بلکہ حضرت چندہ کا زور روز بروز بڑھتا ہی جاتا ہے اور اب تو عالمگیر ہو گیا ہے۔ اگر سرسیّد کے چندہ لینے کے طریقوں اور ترکیبوں کی تفصیل لکھی جائے تو اچھی خاصی کتاب بن جائے۔

وہ کم آمیز اور دیر آشنا تھے لیکن جس سے جو تعلق ہو گیا اُسے آخر دم تک نبھایا۔ اور دوستوں کے تو وہ عاشق تھے۔ مولوی سیّد مہدی علی (نواب محسن الملک) اور سیّد زین العابدین کو جو خط لکھے ہیں انھیں دیکھئے ایک ایک لفظ سے خلوص و صداقت ٹپکتی ہے۔ ایسے خط آپ کو شاید ہی کہیں اور ملیں، یہ اُن کے دلی جذبات کا آئینہ ہیں۔ یہی حالت کم و بیش دوسرے احباب کے ساتھ تھی۔ وہ اُن کے سچے ہمدرد اور اُن کی بہبودی اور سلامتی کے خواہاں رہتے تھے اور جب کبھی ان کے کسی دوست کا انتقال ہو جاتا تو انھیں سخت صدمہ ہوتا اور کئی کئی دن سوگ مناتے تھے۔ وہ دوستی کے مقابلے میں رشتے ناتے کی کوئی حقیقت نہیں سمجھتے تھے۔ اُن کا قول تھا کہ "اگر ساری دُنیا قبضے میں ہو اور کوئی دوست نہ ہو تو وہ ہیچ ہے اگر ساری دنیا کے بدلے میں ایک دوست ہاتھ لگ جائے تو ارزاں ہے۔" لیکن اُن کی دوستی آسان نہ تھی۔ وہ قدامت پرست نہ تھے بلکہ اُنھوں نے بہت سی پُرانی رسموں کو توڑ پھوڑ کے رکھ دیا۔ ہر بات کو تحقیق اور عقل کی کسوٹی پر پرکھتے تھے جو اس میں پوری اُترتی اُس پر عمل کرتے۔ تقلید کے مطلق قائل نہ تھے، جدّت اور نئی روشنی کے حامی تھے۔ خود وہ کئی ایسی بدعتوں اور

جدّتوں کے باقی ہوئے کہ مسلمانوں میں کھلبلی مچ گئی۔ ہر طرف سے مخالفتیں ہوئیں
مطعون ہوئے، مردود ہوئے، مگر انھوں نے کچھ پروا نہ کی، اپنی بات
پر اڑے رہے۔ طوفان آیا بھی اور گزر بھی گیا۔ لیکن ایک دوستی کے معاملے
میں قدامت پرست تھے۔ چندے کی زد ہمیشہ دوستوں ہی پر پڑتی تھی
نئے نئے فنڈ قائم کرتے تھے اور سب سے پہلے فہرست میں دوستوں کے نام
لکھتے اور خود ہی رقم تجویز کر کے ہر ایک کے نام کے سامنے لکھ دیتے۔ طوعاً وکرہاً
دینی ہی پڑتی۔ چندوں سے ان کا ناک میں دم تھا۔ بعض بے تکلف دوست بہت
جھنجھلاتے اور بگڑتے مگر سید صاحب کبھی بُرا نہ مانتے۔ اُن کی باتوں میں کچھ
ایسا جادو تھا کہ لوگ فوراً پسیج جاتے اور جو مانگتے نذر کر دیتے۔ یہ تہیہ ہوتا ہی
رہتا تھا لیکن وہ دوستوں سے اس بات کی بھی توقع رکھتے تھے کہ قومی ہمدردی
کے متعلق اُن کی سب تجویزوں میں ان سے اتفاق کریں۔ وہ عمر بھر مخالفتیں
برداشت کرتے رہے اور یہ ان کے لیے معمولی بات ہو گئی تھی لیکن دوست
کا اختلاف گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ یہ دوستی پرانے وقتوں کی دوستی تھی
پُرانے بزرگ اسی پر عامل تھے، دوست کچھ بھی کہے یا کچھ بھی کرے وہ ادبدا کے
اس کا ساتھ دیتے اور مدد کرتے، لڑتے مرتے جان دینے کو تیار ہو جاتے
انھیں اس سے کچھ بحث نہ تھی کہ یہ فعل بُرا ہے یا بھلا۔ اُن کا مقولہ تھا "ہم یار کی
یاری سے کام اس کے فعلوں سے کیا کام"۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُن کو دوست
بھی ایسے ملے تھے کہ ان پر جان چھڑکتے تھے اور یہ ان کی بڑی خوش
نصیبی تھی۔ یہ سب سید کے خلوص، سچائی، راستبازی اور محبت کا
اثر تھا۔

وہ اپنے دفتر کے ملازموں نیز گھر کے نوکروں سے بڑی شفقت اور

مہربانی کا برتاؤ کرتے تھے کبھی سختی یا درشتی سے پیش نہیں آتے تھے اور ان کے عیوب سے چشم پوشی کرتے تھے جو ایک بار اُن سے بندھ گیا پھر وہ گویا اس کی جاگیر تھی۔ مرتے دم تک ساتھ رہا۔ یوں بھی وہ کسی کی شکایت نہیں سنتے تھے لیکن اگر کسی نے اُن کے ملازم کی بددیانتی، بداطواری وغیرہ کی شکایت کی تو وہ سنی ان سنی کر دیتے تھے اور ان کے اعتماد میں ذرا فرق نہ آتا وہ کسی ملازم کو شکایتیں سننے کے بعد بھی برطرف نہ کرتے۔ یہ بات ان میں پرانی تہذیب کی تھی۔ میں نے ایسے کئی بزرگوں کو دیکھا ہے کہ جب اُنھوں نے کسی پر اعتماد کر لیا تو پھر کوئی کچھ کہا کرے اور کیسی ہی شکایت کرے اُن پر کچھ اثر نہ ہوتا تھا بلکہ اُلٹے خفا ہوتے تھے۔ اسی قسم کی مروت سرسید میں بھی تھی۔ کسی نے سچ کہا ہے "درخانۂ مروّت تباہ" چنانچہ ان کے دفتر کے ہیڈ کلرک شام بہاری لال کے معاملے میں یہی ہوا۔ یہ شخص علی گڑھ کے ممتاز کایستھ خاندان کا تھا۔ اس کا باپ پنجاب میں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر رہ چکا تھا۔ بارہا ان تک شکایت پہنچی کہ یہ آدمی قابل اعتماد نہیں ہے۔ اتنی کم تنخواہ میں وہ جوڑی پر آتا ہے اور بڑی شان سے رہتا ہے۔ اس کی دیانت مشتبہ ہے میں نے بھی اس شخص کو دیکھا تھا وہ فی الحقیقت رئیسوں کی طرح رہتا تھا۔ ان شکایتوں کے جواب میں وہ کہتے کہ شریف زادہ ہے، گھر سے خوش حال ہے وہ صاف ستھرا اور سلیقے سے رہتا ہے تو لوگ اس سے جلتے ہیں جب ان سے یہ کہا گیا کہ پنجاب میں وہ سرکاری ملازم تھا اور روپیہ غبن کرنے کی علت میں سزا پا چکا ہے اُس پر انھوں نے فرمایا کہ شریف ایک بار ٹھوکر کھا کر پھر سنبھل جاتا ہے اور خطا نہیں کرتا۔ اس اعتماد کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ جعلی دستخط بنا بنا کر چیک جاری کرتا رہا اور ایک لاکھ سے کچھ اوپر روپیہ خورد برد کر لیا اس

غبن کا حال اس کے دفعتہً بیمار ہونے پر کھلا۔ اُس سے سیّد صاحب کو جو صدمہ پہنچا وہ بیان سے باہر ہے۔ عدالت کی حاضری کی جو نوبت لگی تو اس سے ان کی پریشانی اور بڑھ گئی۔ شام بہاری لال پر فالج کا حملہ ہوا تھا اور اسی بیماری کی حالت میں گرفتار ہوا اور حوالات میں رکھا گیا۔ اثنائے مقدمہ ہی میں جب کہ وہ حوالات میں تھا کچھ کھا کر مر گیا۔ اس حادثے سے سرسیّد کو تو سخت اذیت اور رنج و ملال پہنچا ہی تھا اکالج کے کاموں پر بھی کچھ دن کے لئے بُرا اثر پڑا۔

نچ کے ملازموں سے بھی ان کی مروت کا یہی حال تھا۔ وہ اس بات کو ہرگز پسند نہیں کرتے تھے کہ ملازموں کے ساتھ بُرا برتاؤ کیا جائے۔ نوکروں نوکروں کی مار پیٹ یا بدزبانی کو نہایت مکروہ فعل اور بداخلاقی سمجھتے تھے۔ چناں چہ جب ایک طالب علم (بورڈ) نے کالج کے ایک ملازم کو کسی بات پر مارا تو سیّد صاحب بہت برافروختہ ہوئے اور انھوں نے حکم دیا کہ اُسے خارج کر دیا جائے۔ اس پر طالب علموں نے بڑا ہنگامہ مچایا اور ان کی ایک بڑی جماعت کالج چھوڑ کر شہر چلی گئی۔ شہر کے ذی اثر اور ہمدرد رئیسوں نے بیچ بچاؤ کی کوشش کی، لیکن سرسیّد کا اصرار تھا کہ جب تک طالب علم ملازم سے معافی نہ مانگے گا اُسے کالج میں داخل نہ کیا جائے گا۔ یہ سبق انھیں والدہ نے دیا تھا۔ لڑکپن میں انھوں نے گھر کے پُرانے ملازم کو کسی بات پر تھپڑ مارا۔ ان کی والدہ کو خبر ہوئی تو بہت ناراض ہوئیں اور کہا اسے گھر سے نکال دو، یہ اس گھر میں رہنے کے لائق نہیں رہا۔ چناں چہ ایک ماما ہاتھ پکڑ کر گھر سے باہر لے گئی اور سڑک پر لا کر چھوڑ دیا۔ تین دن تک خالہ کے مکان میں چھپے رہے۔ تیسرے دن خالہ والدہ کے پاس لے گئیں تاکہ قصور

معاف کرائیں۔ اُنھوں نے کہا جب تک وہ نوکر سے قصور معاف نہ کرائے گا۔ میں
معاف نہیں کروں گی۔ چنانچہ جب نوکر کے آگے ہاتھ جوڑے تو قصور معاف ہوا۔
یہی ایک نہیں انھوں نے اخلاق کے بہت سے سبق اپنی والدہ سے سیکھے اور
عمر بھر اُن پر عمل کیا۔

وہ بڑے خوددار تھے۔ اور کسی ایسی بات کو جو خودداری کے خلاف ہوتی
برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ ابتدا میں جب وہ مدرسۃ العلوم قائم کرنے کا
ڈول ڈال رہے تھے، انڈین آبزرور میں اس کے خلاف ایک آرٹیکل
چھپا جس میں یہ لکھا تھا کہ مسلمان سخت متکبّر اور متعصّب ہیں اور یہی وجہ
ہے کہ گورنمنٹ کالجوں اور اسکولوں سے فائدہ حاصل نہیں کر سکتے۔ اس کے
جواب میں سرسیّد نے بڑا سخت آرٹیکل لکھا اور لکھا کہ "ہاں ہم متکبر بھی
ہیں اور متعصّب بھی، پر کیوں نہ ہم ایسا طریقہ تعلیم اختیار کریں جس سے ہمارے
تکبّر اور تعصّب میں بھی خلل نہ آئے اور ہم تعلیم بھی پائیں۔"

وہ اپنے طالب علموں سے بھی ایسی ہی خودداری کی توقع رکھتے تھے
ایک سال (غالباً ۱۸۹۲ء میں) مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس علی گڑھ میں
تھا اجلاس ختم ہو گیا تھا، سب چلے گئے تھے اور ہال خالی تھا صرف سیّد صاحب
رہ گئے تھے جو میز پر سے اپنے کاغذ سمیٹ رہے تھے۔ اس اثنا میں طالب علم
چپکے چپکے آتے اور کرسیوں پر بیٹھتے جاتے تھے۔ سیّد صاحب نے جو یہ دیکھا
تو پوچھا کیا ہے، کیوں جمع ہو رہے ہیں؟ ایک طالب علم نے کھڑے ہو کر کہا کہ
کانفرنس میں بمبئی کے ایک سیٹھ صاحب آتے ہیں وہ طالب علموں کو مٹھائی
تقسیم کریں گے۔ یہ سُننا تھا کہ برس پڑے اور کہا تم بڑے بے غیرت ہو کہ
مٹھائی کے لالچ میں یہاں بھکاریوں کی طرح آ بیٹھے ہو تمھیں شرم نہیں آتی

کیا کالج سے تم نے یہی بے غیرتی سیکھی ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اب لڑکے کھسکنے شروع ہوئے اور چند منٹ میں ہال خالی ہوگیا اور سرسید صاحب اپنے کاغذ سمیٹ کر رخصت ہوگئے۔ اُن کی بڑی تمنا تھی کہ مدرستہ العلوم کے طلبہ ہمّت، جرأت اور شریفانہ اخلاق سے متصف ہوں۔ اور جب کبھی کسی طالب علم سے اخلاقی جرأت یا خودداری کا فعل صادر ہوتا تو بہت خوش ہوتے۔

ایسی ہی خودداری کا ایک دوسرا واقعہ لکھتا ہوں۔ ان کے ایک عزیز دوست (غالباً مولوی مشتاق حسین) نے جب کہ وہ یو۔پی میں کسی سررشتے میں ملازم تھے۔ یہ اطلاع دی کہ ان کا افسر نماز پڑھنے پر معترض ہوتا ہے۔ سیّد صاحب نے اس کے جواب میں جو خط لکھا وہ پڑھنے اور یاد رکھنے کے قابل ہے۔ وہ لکھتے ہیں :-

"بھائی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کل میں سارے دن متردد رہا، کیونکہ تمہارا کوئی خط نہیں آیا تھا۔ آج خط آیا اور حال معلوم ہوا۔ گو میں کسی وقت بے وقت کا بھی خیال نہیں کرتا۔ دو دو اکٹھی بھی ملا کر پڑھ لیتا ہوں۔ ریل میں جتنا سفر ہو مجھ سے ادا نہیں ہوسکتی۔ یہ باتیں مجھ میں ہیں اور نالائقی اور شامت اعمال سے ایسی سستی نماز میں ہے مگر تم نے اس معاملے میں جو پیش آیا نہایت لچر پنا کیا۔ نماز جو خدا کا فرض ہے اس کو اپنی شامتِ اعمال سے جس خرابی سے ہو، ادا کریں یا قضا کریں۔ لیکن اگر کوئی شخص یہ کہے کہ تم نماز نہ پڑھو تو اس کا صبر ایک لمحہ بھی نہیں ہوسکتا۔ یہ بات سُنی بھی نہیں جاسکتی۔ میری سمجھ میں نماز نہ پڑھنا صرف گناہ ہے، جس کے بخشے جانے کی توقع ہے اور کسی شخص کے منع کرنے سے نہ پڑھنا یا سستی میں ڈالنا میری سمجھ میں کفر ہے جو کبھی بخشا نہ جائے گا۔ تم کو یا تو پہلے ہی خود اپنی شامتِ اعمال سے ایسا طریقہ اختیار کرنا تھا جو کبھی

اس قسم کی بحث نہ آتی اور جب ایسا طریقہ اختیار نہیں کیا تو پھر لجلجانا اور گڑگڑانا، اور حضور رخصت ہی دیں تنخواہ کاٹ لیں کہنا واہیات تھا تزانی سافی استعفادے دینا تھا۔ صاف کہہ دینا تھا کہ میں اپنے خدائے عظیم الشان قادر مطلق کے حکم کی اطاعت کروں گا نہ آپ کی کہا ہوتا؟ نوکری نہ میسّر ہوتی فاقے مر جاتے نہایت اچھا ہوتا۔ والسلام"۔

سیرت فریدیہ میں سرسید نے جو حالات لکھے ہیں ان کے پڑھنے سے ظاہر ہے کہ گھر کے سارے انتظام اور اولاد کی تربیت کا بار اُن کی والدہ پر تھا۔ یہ سرسید کی خوش نصیبی تھی کہ ان کی والدہ بڑی دانش مند اور نیک سرشت بی بی تھیں اور ان میں انسانی اخلاق کی بہت سی خوبیاں تھیں۔ سرسید کی زندگی پر ان کا بڑا اثر تھا۔ عام توہمات جو مسلمانوں میں مذہب کے نام سے مروج ہو گئے ہیں ان کے گھر میں ان باتوں کا مطلق چرچا نہ تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ "اس زمانے میں جب کہ میرے مذہبی خیالات اپنی ذاتی تحقیق پر مبنی ہیں، اب بھی میں اپنی والدہ کے عقائد میں کوئی ایسا عقیدہ جس پر شرک یا بدعت کا اطلاق ہو سکے نہیں پاتا"۔ غرض کہ مذہبی پابندی ابتدا سے اُن کی تعلیم و تربیت کا جز تھی۔ لیکن جب انھوں نے مسلمانوں کی اصلاح اور خصوصاً مغربی تعلیم کی ترویج کا بیڑا اُٹھایا تو انھیں مذہبی مسائل اور مذہبی تحقیق کی طرف خاص طور سے توجہ کرنی پڑی۔ کیوں کہ اُن کی اس تحریک کے خلاف سارے ملک میں مخالفتوں کا جو زبردست طوفان اُٹھا اور اعتراضات کی جو بوچھاڑ ہر طرف سے ہوتی وہ سب مذہب کی بنا پر تھی۔ علاوہ اس کے عیسائی مشنریوں اور یورپی مصنفوں کی طرف سے اسلام کی حقانیت اور بانی اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سیرت پر

پے درپے حملے ہورہے تھے۔ ہندستان کی انگریزی حکومت کے ارکان نے اسلام کو فساد و بغاوت کا بانی مبانی قرار دے رکھا تھا اور یہ بات اُن کے دل میں جاگزیں تھی کہ مسلمان از روئے مذہب حکومت انگریزی سے بدخواہی اور بغاوت کرنے پر مجبور ہیں۔ ان سب آفتوں سے بڑھ کر ایک آفت یہ تھی کہ قوم کے نوجوان جو کالجوں اور یونی ورسٹیوں میں مغربی تعلیم پا رہے تھے اُن کے دلوں میں اسلام کی طرف سے شکوک پیدا ہو رہے تھے اور وہ مذہب سے بیگانہ اور متنفر ہوتے جا رہے تھے۔ مولوی صاحبان، ان کی کتابیں اور مناظرے تشفی نہیں کرسکتے تھے کیوں کہ جدید سائنس نے پرانے حربوں کو بیکار کر دیا تھا۔ سیّد صاحب نے بڑی دلیری اور جرأت اور کمال تحقیق اور محنت سے ان تمام خطروں کا مقابلہ کیا اور اس مقابلے کے لیے انھیں ایک نیا علمِ کلام ایجاد کرنا پڑا۔ یہ اُن کا ایسا عظیم الشان کام ہے کہ اس کے تفصیلی بیان کے لئے ایک دفتر درکار ہے۔ مختصر یہ کہ اوہامِ باطلہ اور خیالاتِ فاسدہ جو مذہب کی آڑ لے کر اسلام اور اہلِ اسلام میں گھر کر چکے تھے، اُن کا قلع قمع کیا۔ جن بااثر انگریزوں نے یہ ثابت کیا تھا کہ اسلام غداری اور بغاوت سکھاتا ہے اور مسلمان کبھی حکومت کے وفادار نہیں ہوسکتے اور جن یورپین مصنفوں نے یہ لکھا تھا کہ اسلام ترقی کا مانع ہے اُن کی تحریروں کے دندان شکن جواب دیے۔ جس زمانے میں حکومت نے وہابیوں پر ظلم توڑے اور ان کے عقائد کو فساد اور بغاوت کا سرچشمہ قرار دیا تو بڑی دلیری سے اُن کی حمایت کی اور اُن کے خلاف جو کچھ کہا گیا اور لکھا گیا اس کی پُر زور تردید کی۔ یہاں تک کہ اس کا صاف اقرار کیا کہ میں خود وہابی ہوں۔ سر ولیم کی کتاب کے جواب لکھنے کی تیاری کی جس میں اسلام پر رسول اللہ صلعم کی سیرت پر سخت اعتراض کئے گئے تھے۔ ہندستان میں کافی سامان میسّر نہ آیا تو لندن

کا سفر کیا اور وہاں کے کتب خانوں اور دوسرے ذرائع سے کتابیں مہیا کیں اس کی تیاری اور طباعت میں مصارف اس قدر بڑھ گئے کہ اپنا کتب خانہ اور سامان وغیرہ فروخت کرنا پڑا، قرض لیا اور دوستوں سے روپیہ جمع کیا اور شب و روز محنت شاقہ اُٹھا کر ایسا مدلّل جواب لکھا کہ مخالف بھی مان گئے نئے تعلیم یافتہ لوگوں کے شکوک رفع کرنے کے لئے بے شمار مضامین لکھے۔ تقلید کے خلاف زبردست مضامین تحریر کئے۔ ابطال غلامی پر ایک رسالہ لکھا اور یہ ثابت کیا کہ لونڈی غلام بنانے کا کوئی حکم قرآن مجید کی کسی آیت یا کسی حدیث صحیح میں نہیں۔ سید احمد خاں پہلے شخص تھے جنھوں نے یہ دعویٰ کیا کہ اسلام میں غلامی نہیں اور اسے ثابت کر کے دکھا دیا۔ تحقیق اور اجتہاد میں جو جمود پیدا ہو گیا تھا اُسے توڑا۔ بہت سے مسائل کی اُلجھنوں کو سلجھایا۔ غرض اسلام کی وہ بے نظیر خدمت کی جو کسی دوسرے سے نہ بن آئی۔

سرسید بڑے پکے اور سچے مسلمان تھے اور جیسا کہ اُنھوں نے بارہا کہا ہے کہ میں اس لئے مسلمان نہیں ہوں کہ مسلمان گھرانے میں پیدا ہوا بلکہ اسلام پر میرا یقین میری ذاتی تحقیق پر ہے۔ وہ اپنے ایک دوست کو جن کے دل میں یہ خطرہ پیدا ہوا کہ کہیں وہ انگلستان جاکر ترک اسلام نہ کر دیں لکھتے ہیں "جیسا کہ میں خود اپنی تحقیق سے، نہ تقلید سے، دین اسلام کو حق سمجھتا ہوں اس قدر یقین آپ کے شہر کے بڑے بڑے لمبی ڈاڑھی والوں کو ہزار ہزار دانے کی تسبیح والوں کو اور جو مکہ مدینہ سے پیر و مرشد کا جبہ و دستار لے کر آئے ہیں ان کو بھی نہیں"۔ ایک دوسرے دوست کو اسی بارے میں تحریر کیا، "اگر خدا مجھ کو ہدایت نہ کرتا اور تقلید کی گمراہی سے نہ نکالتا اور میں خود تحقیقات اسلام پر توجہ

نہ ہوتا تو یقینی مذہب کو چھوڑ دیتا۔" اسلام پر جہاں کسی نے کوئی نکتہ چینی کی وہ فوراً اس کا جواب لکھنے چنانچہ اس زمانے میں جبکہ ان کی حالت بہت نازک تھی ایک عیسائی نے امہات المومنین پر ایک رسالہ لکھا جس میں آنحضرت صلعم کے ازواج اور آپ کے اخلاق پر بہت سخت اعتراض کئے گئے تھے۔ باوجود یکہ کثرت آلام کی وجہ سے ان پر بقول مولانا حالی "ایسا سکتے کا سا عالم طاری تھا کہ وہ بالکل نقش دیوار بن گئے تھے" مگر اسی حالت میں اس رسالے کا جواب لکھنا شروع کیا۔ ابھی یہ تحریر پوری نہ ہونے پائی تھی کہ رحلت فرما گئے۔

اگرچہ وہ پکے مذہبی اور اسلام کے شیدائی تھے مگر تعصب اُن میں نام کو نہ تھا۔ ان کے احباب میں ہندو اور عیسائی بھی تھے اور اُن سے اُن کا برتاؤ ویسے ہی خلوص اور محبّت کا تھا جیسا مسلمان دوستوں سے۔ انھوں نے کبھی کوئی ایسی بات نہ لکھی جس سے دوسرے مذہب والوں کی دل آزاری ہو۔ اگرچہ بعض معاملات میں انھیں ہندو سر گروہوں سے اختلاف تھا لیکن اس اختلاف کا اثر کبھی اُن کے اخلاق یا برتاؤ پر نہیں پڑا اور وہ ہمیشہ باہمی اتحاد اور آشتی کی تلقین کرتے رہے۔ یہ محض زبانی باتیں نہ تھیں بلکہ اس پر اُن کا عمل بھی تھا۔ یہ سب کو معلوم ہے کہ سوامی دیانند سرسوتی نے اپنی کتاب ستیارتھ پرکاش میں اسلام اور بانی اسلام صلعم کے خلاف ناقابل برداشت دریدہ دہنی سے کام لیا ہے جس نے ہندو مسلمانوں میں سخت منافرت پھیلادی تھی لیکن جب سوامی جی کا انتقال ہوا تو سرسیّد نے اُن کی وفات پر بڑا آرٹیکل لکھا اور اُن کے اصلاحی کاموں کی بیحد تعریف کی جسے پڑھ کر حیرت ہوتی تھی۔ یہ ہے ایک سچّے اور پکّے مسلمان کی بے تعصبی اور رواداری۔ یہ ایک نہیں ایسی اُنکی بیسیوں تحریریں ہیں۔

افسوس کہ اُن کی زندگی کے آخری ایّام انتہا درجے کی تلخی اور کرب و الم میں گزرے۔ پہلا صدمہ کالج کے روپے کے غبن کا ہوا اور دوسرا اُس سے بڑھ کر سیّد محمود کا۔ کثرت شراب نوشی نے سید محمود کا دماغ مختل کر دیا تھا اور وہ عالم دیوانگی میں ایسی حرکات کر بیٹھتے تھے جو کسی عنوان قابل برداشت نہیں ہو سکتی تھیں۔ سر سیّد کو ناچار وہ گھر چھوڑنا پڑا جہاں وہ تیس سال مسلسل رات دن کام کرتے رہے تھے اور ایک غیر گھر میں جا کر پناہ لینی پڑی۔ اس رنج نے جو اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا سیّد صاحب کو بٹھا دیا، دل بجھ گیا، خوش دلی جاتی رہی۔ لیکن وہ لگن جو دل کو لگی ہوئی تھی اس کی آگ اس وقت بھی باقی تھی۔ موت سے چند روز پہلے تک، جب تک کہ بالکل مجبور نہ ہو گئے۔ قومی معاملات پر برابر لکھتے رہے۔ آخر وہ دن آپہنچا جو کسی کے ٹالے نہیں ٹلتا اور وہ قوم کا فدائی ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو ہمیشہ کے لئے اس دُنیا سے رخصت ہو گیا۔

وہ ہم میں نہیں رہا لیکن وہ اپنی زندگی کا ایسا عظیم الشان کارنامہ چھوڑ گیا ہے جو ہمارے لئے صحیفۂ ہدایت ہے۔ اُس کی رائے اور اجتہاد میں کہیں کہیں غلطیاں بھی نظر آئیں گی لیکن اس کے خلوص و صداقت اور راست کرداری میں مطلق شک شبہ کی گنجائش نہیں۔ اس برعظیم کے مسلمانوں میں بڑے بڑے مجاہد، ذی علم و فضل، پاک نفس بزرگ اور مصلح گزرے ہیں۔ لیکن ان کا دائرۂ عمل ایک یا دو مہمات تک محدود تھا۔ لیکن سر سیّد کا میدان عمل قومی زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی تھا۔ ایسا جامع صفات اور جامع حیثیات، بے لوث و بے نفس، پُرعزم و استقلال، سراپا خلوص و صداقت اور ہمہ تن ایثار مصلح ہمیں اس سے پہلے اور نہ اس کے بعد نصیب ہوا۔ اس نے ایک مایوس اور افسردہ قوم میں ایک نئی روح پھونک دی اور ایسا قوی جذبۂ قومی پیدا کیا جو اب تک

کام کر رہا ہے۔ حق یہ ہے کہ قومیت کا خیال بھی اسی کا پیدا کیا ہوا ہے۔ اگر اس کی زندگی کا بہ غور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ قصر پاکستان کی بنیاد میں سب سے پہلی اینٹ اسی پیر مرد نے رکھی تھی۔ اس کا دل قوم کی دردمندی سے لبریز تھا۔ عمر بھر اسی دھن میں لگا رہا، اور آخر دم تک مردانہ وار بلکہ دیوانہ وار کام کرتے کرتے دنیا سے چل بسا۔ اس کے پاس نہ رہنے کو گھر تھا نہ مرنے کو۔ جب مرا تو کفن کیلئے ایک پیسہ نہ نکلا۔ عزیزوں نے اپنے خرچ سے اس کی تجہیز و تکفین کی۔ یہ ہے مقبول بندوں کی شان۔

زیستن در فکرِ قوم و مردن اندر بندِ قوم
گر تو انائی ہمی توانی سیّد احمد خاں شدن

ڈاکٹر محمد اقبال

ڈاکٹر محمد اقبال مجھے اکثر یاد آتے ہیں۔ شاید میں انھیں کبھی نہ بھولوں گا
میں اپنی زندگی میں سینکڑوں اشخاص سے ملا ہوں اور ملتا رہا ہوں۔ ان میں عالم
و فاضل بھی ہیں، ادیب و شاعر بھی ہیں، صاحبِ ثروت بھی ہیں اور مفکر و مجتہد بھی،
لیکن ایسے دو چار ہی ملے جن میں انسانیت بھی ہو اور یہ وہ شئے ہے جو بہت کمیاب
ہے۔ اسی خوبی کی وجہ سے میرے دل میں ڈاکٹر محمد اقبال کی بیحد قدر ہے۔

وہ علم دوست اور علم کے شیدائی تھے اور حقیقی معنوں میں پروفیسر تحقیق کا
چسکا شروع ہی سے تھا۔ میرا ایک دوست ایک قدیم عربی تاریخ کا مطالعہ کر رہے
تھے۔ ایک لفظ اس میں ایسا آگیا تھا جو اُن کی سمجھ میں نہ آیا۔ بہت سی لغات کی ورق
گردانی کی کچھ پتہ نہ چلا۔ عربی کے کئی قدیم و جدید عالموں سے رجوع کی، کسی سے شافی
جواب نہ ملا۔ ایک بار وہ میرے ساتھ لاہور آئے۔ ایک ملاقات میں حسنِ اتفاق
سے انھوں نے ڈاکٹر صاحب سے بھی اس لفظ کا ذکر کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے ادنیٰ
تامّل کے بعد اُس کی حقیقت بتادی۔ پھر وہ اپنے کتاب خانے میں گئے، اور ایک
کتاب تلاش کرکے لائے جس سے اُن کے خیال کی تائید ہوتی تھی۔ میرے دوست کو
بہت حیرت ہوئی اور وہ ڈاکٹر صاحب کے تبحر کے قائل ہوگئے۔

فارسی زبان پر بھی اُنھیں بہت عبور تھا۔ ایک علمی تقریب کے سلسلے میں

ایران بھی ہو آئے تھے فارسی بلا تکلف بولتے اور لکھتے تھے۔ کیمبرج میں دو سال پروفیسر براؤن کے ساتھ کام کیا اور اسی زمانے میں سلجوق نامہ ابن بی بی ایڈٹ کیا

ڈاکٹر صاحب کا ذاتی کتب خانہ ایسا ہی تھا جیسا ایک پروفیسر اور محقق کا ہونا چاہیئے۔ اس میں اُردُو، فارسی، عربی، انگریزی، فرانسیسی، جرمن کی منتخب اور اُن کے اپنے ذوق کی کتابیں تھیں۔ بعض نسخے بہت بیش قیمت اور نادر تھے۔

علم کے ساتھ صحیح ذوق بھی ضروری ہے۔ علم کتنا ہی وسیع ہو صحیح ذوق نہ ہو تو علم بے نتیجہ اور بے ثمر ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا ذوق بہت سلیم اور پاکیزہ تھا اور یہ ذوق علم و ادب تک ہی نہ تھا بلکہ یہ کھانے پینے، لباس، بات چیت، ملاقات دوستوں کے انتخاب، غرض زندگی کی ہر چھوٹی بڑی چیز میں نظر آتا تھا۔ موسیقی میں بھی دخل تھا اور اس کا اچھا ذوق رکھتے تھے۔

اُن کا ادبی ذوق بھی بہت شستہ تھا۔ وہ بہت صاف اور شگفتہ اُردو لکھتے تھے۔ اُردُو کے عاشق تھے۔ اور اسے برصغیر کے مسلمانوں کی قومی زبان خیال کرتے تھے۔ تقسیم ملک کے بعد انھیں بڑی تشویش ہوگئی تھی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اُردُو ہاتھ سے نکل جائے۔ کہتے تھے اگر اُردُو نہ رہی تو ہماری قومیت بھی رخصت ہو جائے گی اور پاکستان نہیں رہے گا۔ ہماری قوت اور ہمارا اتحاد اُردُو ہی کی بدولت ہے۔ بعض وقت اس خیال سے سخت پریشان اور افسردہ خاطر ہو جاتے تھے۔ اُن کے گھر میں زیادہ تر اُردُو ہی بولی جاتی تھی۔

ادارۂ معارفِ اسلامیہ کے سکریٹری تھے اور اس کام سے انھیں دلی لگاؤ تھا۔ یہ ادارہ کیوں وجود میں آیا، اس کی بھی ایک تاریخ ہے۔ آل انڈیا اورینٹل کانفرنس میں ابتدا میں عربی، فارسی، اور اُردُو کا ایک مستقل شعبہ تھا۔ بعد میں کونسل نے جس میں مسلمان ممبر گنتی کے چار ہوتے تھے، اُردُو کو انڈین سیکشن

میں اور فارسی کو ایرانی شعبہ میں ضم کر دیا۔ عربی، اسلامیات اُن سے جُدا ہو گئے۔ یہ امر کانفرنس کے مسلمان ارکان کی ناخوشی کا باعث ہوا، اور اُنھوں نے اپنا ایک الگ ادارہ قائم کرنے کا ارادہ کیا۔ علامہ محمد اقبال نے اس کی ہمت افزائی کی اور آخر اس کا قیام عمل میں آگیا۔ اعلاحضرت حضور نظام نے دس ہزار یک مشت اور تین ہزار سالانہ کی رقم منظور فرمائی اس کے اجلاس ہر دو سال کے بعد ہوا کرتے تھے چناں چہ یہ اجلاس ۱۹۳۲ء ۱۹۳۶ء اور ۱۹۳۸ء میں ہوئے اور اس میں بڑے اچھے اچھے مقالے پڑھے گئے۔ ۱۹۳۸ء کے بعد سے اس کا کام سُست پڑ گیا تو میں نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا کہ آپ کے ادارۂ معارف کے جلسے اب کیوں نہیں ہوتے کہنے لگے اُسے اب کوئی دعوت نہیں دیتا۔ ایک آدھ جگہ سے دعوت آئی مگر وہ ملتوی ہو گئی۔ اتنا سرمایہ اس کے پاس ہے نہیں کہ وہ خود انتظام کر سکے میں نے کہا آپ دلّی میں جلسہ کیجیے میں سب انتظام کر دوں گا۔ ہمیں اس کے لئے کسی کی محتاجی نہ ہوگی۔ انجمن کا مکان بہت بڑا ہے اور اس کا صحن بہت وسیع ہے وہیں اس کا جلسہ ہو جائے گا۔ مصارف کے لئے رقم بھی فراہم ہو جائےگی بہت خوش ہوئے اور اسی وقت سے دلی میں ۱۹۴۷ء کے اجلاس کی سوچنے لگے، لیکن ۱۹۴۷ء ایسا بھاگوان نکلا کہ کسی کے ہوش وحواس بجا نہ رہے اور دلّی ہم سے ہمیشہ کے لئے چھوٹ گئی۔ میرا ارادہ تھا کہ کراچی میں ہمارے قدم ذرا جم جائیں تو معارف اسلامیہ کو مدعو کروں، لیکن افسوس صد افسوس! کہ ڈاکٹر صاحب دفعتہً قلب کی حرکت بند ہونے سے انتقال کر گئے۔ اُن کی بے وقت وفات سے پنجاب یونی ورسٹی نیز علمی طبقے کو بڑا صدمہ پہنچا۔

بڑی خوبیوں کے آدمی تھے۔ محبت اور ہمدردی اُن کی گھٹی میں تھی

اگرچہ وہ خاموش طبع تھے اور ان میں عالمانہ متانت پائی جاتی تھی، لیکن اپنے بے تکلف دوستوں کی صحبت میں خوب باتیں کرتے تھے جس سے اُن کی زندہ دلی کا ثبوت ملتا تھا۔ اُن کے خاص دوستوں کا حلقہ محدود تھا، مگر دوستی کے بڑے پکّے تھے اور جس سے جو تعلّق تھا اُسے آخر تک نبھایا۔ اپنے شاگردوں اور رفیق پروفیسروں سے اُن کے دوستانہ اور مخلصانہ تعلّقات تھے اور وہ بھی اُن سے عزّت و محبّت سے پیش آتے تھے۔ کبھی کبھی وہ خفا بھی ہو جاتے تھے۔ مگر اس خفگی میں کوئی تلخی یا دل آزاری نہیں ہوتی تھی اور کچھ دیر بعد اس کا کوئی اثر باقی نہیں رہتا تھا۔

اورنٹیل کالج میگزین کی ترتیب وغیرہ میں بھی ان کا بڑا حصّہ تھا۔ خود بھی لکھتے اور دوسروں سے بھی لکھواتے۔ اُن کے زمانے میں یہ میگزین بڑے عروج پر تھا اور اُس کا علمی پایہ بہت بلند ہوگیا تھا۔

وہ بڑے مہمان نواز تھے اور اپنے مہمانوں کی خاطر تواضع میں بہت مبالغہ کرتے تھے یہیں دن ہی کھانا نہیں کھاتا وہ یہ جانتے تھے، مگر جب تک میں اُن کا مہمان رہا وہ ہر روز دوپہر کے کھانے کے وقت میرے سر ہو جاتے اور بہت اصرار کرتے۔ مجھے اُن سے پیچھا چھڑانے میں بڑی دشواری ہوتی۔ چائے کے بڑے شوقین تھے۔ تڑکے مُنہ اندھیرے وہ میرے کمرے میں آجاتے اور اپنے ہاتھ سے چائے بناتے۔ خود بھی پیتے اور مجھے بھی پلاتے۔ اس کے بعد وہ میرے ساتھ ٹہلنے کو جاتے۔ رستے میں ہر قسم کی باتیں ہوتیں، اُس وقت اُن کا مزاج شگفتہ ہوتا تھا اور بڑے مزے مزے کی باتیں کرتے تھے۔

وہ بہت بے نفس شخص تھے۔ جلبِ زر کا عارضہ جو آج کل نئی تانتی میں عام طور پر پایا جاتا ہے اُن میں بالکل نہ تھا۔ میں نے اُن سے ایران بہ عہدِ ساسانیان

کے ترجمے کی درخواست کی۔ اصل کتاب فرانسیسی زبان میں ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے بڑی محنت اور شوق سے ترجمہ کرکے مجھے بھیج دیا۔ میں نے معاوضے کے طور پر انجمن کی طرف سے پندرہ سو روپیہ کا چیک اُن کی خدمت میں پیش کیا۔ اُس کے جواب میں اُنھوں نے لکھا کہ میں نے یہ ترجمہ کسی معاوضے کے خیال سے نہیں کیا تھا۔ میں اُسے اپنے ذاتی صرف میں نہیں لانا چاہتا۔ میں اس رقم کو پنجاب یونی ورسٹی کو اُردو تقریری مقابلے کے لئے دیدوں گا اور یہ تقریری مقابلہ آپ کے نام سے موسوم ہوگا۔ میں نے لکھا کہ مجھے منظور نہیں اور میں اُسے پسند نہیں کرتا۔ اُنھوں نے جواب دیا اور اگر آپ اسے منظور نہ کریں گے تو چیک واپس کردوں گا۔ ہرچند میں نے اُن سے معذرت کی اور سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ نہ مانے اور اس میں اُنھوں نے خلاف معمول اس قدر اصرار کیا کہ آخر مجھ کو ہی جھکنا پڑا۔[1]

ڈاکٹر صاحب کی بڑی خوش قسمتی تھی کہ اُن کی اولاد بھی بڑی سعادت مند، نیک کردار اور علم کی شائق نکلی۔ یہ اُن کی تربیت، ذاتی مثال اور نیک نیتی کا پھل تھا۔

ایسے بلند نظر، شریف النفس، بے تعصب، نیک خیال شخص بہت کم دیکھنے میں آتے ہیں۔ ہمیں پاکستان کو کامیاب بنانے کے لئے ایسے بہت سے اشخاص کی ضرورت ہے۔ خدا کرے پاکستان کی قومی تعمیر میں ایسے مبارک ہاتھوں سے کام لیا جائے۔

---

[1] یہ تقریری مقابلہ یونی ورسٹی کے زیر اہتمام اب بھی ہر سال ہوتا ہے اور مولانا عبدالحق صاحب کے اسم گرامی سے موسوم ہے۔

مولانا حسرت موہانی

۱۹۵۱ء

اگر کوئی ناواقف پہلی بار مولانا حسرت کو دیکھتا تو سمجھتا کہ یہ کوئی مخبوط الحواس شخص ہے۔ ان کی ٹوپی پہ جو اکثر ترکی ہوتی تھی آدھ آدھ انگل چیکٹ جما ہوتا تھا۔ داڑھی پریشان، لباس میں کوئی سلیقہ نہیں، نہ میلا نہ اجلا جوتے نے کبھی برش کی صورت نہ دیکھی تھی، آواز جھینگر سے ملتی جلتی لیکن اس بے ڈول قالب میں بے پایاں روحانی قوت، اخلاقی جرأت اور خلوص و صداقت تھی۔ آزادی کا ایسا شیدائی کوئی کم ہوگا، اس کی خاطر انھوں نے طرح طرح کی مصیبتیں، ایذائیں اور عقوبتیں جھیلیں لیکن ان کے قدم میں کبھی لغزش نہ آئی۔ اپنے خیال کے اظہار میں نہایت بے باک، جس طرح انھوں نے کانگرس میں کامل آزادی کی آواز اٹھائی اسی طرح مسلم لیگ میں بھی یہ نعرۂ حق بلند کیا۔ وہ کسی سے مرعوب نہیں ہوتے تھے بلکہ دوسروں پر چھا جاتے تھے۔ بھارت کی دستور ساز مجلس اور پارلیمنٹ میں بھی ان کی آزادی اور جرأت کا یہی رنگ تھا۔ بعض وقت ان کی للکار سے سردار پٹیل اور ان کے ساتھی گھبرا اٹھتے تھے۔ کبھی کبھی وہ اپنے خیالات میں الجھ جاتے اور متضاد باتیں کہہ جاتے لیکن جلد راستے پر آجاتے تھے۔ تصنع اور تکلف ان کو چھو نہیں گیا تھا۔

اُن کی زندگی انتہا درجے کی سادہ تھی۔ بالکل درویش صفت تھے بعض اوقات وہ ہاتھ میں تھیلا لٹکائے اور بغل میں پوٹلی دبائے پیدل اسٹیشن کو جاتے نظر آتے تھے۔ وہ چھوٹے بڑے امیر غریب سب سے بے تکلف ملتے اور بے تکلف باتیں کرتے۔ اُن کے ہاں کوئی راز نہ تھا۔ سب کچھ کہتے چلے جاتے تھے۔ نہایت منکسر مزاج، حلیم الطبع اور ہمدرد تھے۔ کوئی اُن کے پاس اپنی مصیبت یا بے انصافی کا دُکھڑا لے کر جاتا تو اُس کے لئے دَوڑے دوڑے پھرتے اور لڑتے جھگڑتے تھے۔ رائے کے اختلاف سے ذاتی تعلق اور ملاقات میں کبھی فرق نہ آتا۔ اِن معاملات میں وہ خوب بحث کرتے اور بعض اوقات شدّت کے ساتھ۔ لیکن اُن کا دل صاف رہتا تھا۔ وہ اُن لوگوں سے بھی جو سیاسی امور میں اُن سے اختلاف رکھتے تھے۔ لطف اور اخلاق سے پیش آتے تھے۔ اُن میں بعض اُن کے دوست بھی تھے، باوجود اس کے دوستی کا احترام کرتے۔

سالہا سال تک اُردوئے معلّی اُن کی ادارت میں نکلتا رہا۔ اس رسالے نے ادبی ذوق کے پھیلانے میں بڑا کام کیا۔ اس میں اچھے تنقیدی اور ادبی مضامین نکلتے رہے۔ اس کے علاوہ اس میں ایک یہ بات بڑی اچھی تھی کہ بعض ایسے اچھے شعرا کے کلام کا انتخاب بھی چھپتا رہتا تھا جن کا کلام کبھی طبع نہیں ہوا تھا یا کبھی طبع ہوا تھا تو اب نایاب تھا۔ ہمارے ادیبوں میں بعض ایسے بھی تھے جیسے مولانا ابوالکلام آزاد یا مولانا ظفر علی خاں جو ادب سے ہٹ کر سیاست کے میدان میں کود پڑے۔ ان کے اس عمل سے سیاست کو تو کچھ فائدہ پہنچا نہیں البتہ ادب کو نقصان پہنچ گیا۔ مولانا حسرت ایسے ادیب تھے جنھوں نے باوجود اوّل سے آخر تک سیاست میں

شور بور ہونے کے ادب کے دامن کو نہ چھوڑا، اور جس طرح انھوں نے سیاست میں ہنگامہ برپا کر کے آزادی، حق گوئی اور جرأت کی بے نظیر مثال پیش کی، اسی طرح انھوں نے اپنے افکار و خیالات سے شعر کا درجہ بلند کر دیا۔ وہ سوائے شعر کے ہر چیز میں خواہ وہ زندگی کی سادگی ہو یا سیاست، انتہا پسند تھے۔ شعر میں انھوں نے اعتدال، متانت اور حسن ذوق کو قائم رکھا۔ اردو شاعری پر اُن کا بڑا احسان ہے اور اس سے ہماری شاعری میں اُن کا خاص مقام ہے۔ اُن کی وفات ہر اعتبار سے صدمۂ عظیم ہے۔ لیکن ایک بات کا مجھے بہت زیادہ افسوس ہے۔ اُن کے کتب خانے میں اُردو کا بہت اچھا اور بیش بہا ذخیرہ ہے۔ بہت سے مخطوطات، پُرانے تذکرے، قدیم اساتذہ کا کلام، پُرانے اخبار اور رسالے اور بہت سے ایسی مطبوعات ہیں جو اب نایاب ہیں، اور جو انھوں نے بڑی احتیاط اور محنت سے جمع کی تھیں، میں نے بارہا اس طرف توجّہ دلائی اور کہا کہ اس ذخیرے کو کسی ایسی جگہ محفوظ کر دیجئے کہ تلف ہونے سے بچ جائے۔ میں نے یہ بھی عرض کیا کہ اگر آپ ان ذخیروں کو انجمن ترقی اُردو کو عنایت فرما دیں تو ہم انجمن کے کتب خانے میں ایک خاص حصّہ آپ کی یادگار میں وقف کر دیں گے۔ انجمن اس کی قیمت دینے کو تیار رہے۔ وہ ہمیشہ وعدہ کرتے رہے لیکن کبھی ایفائے وعدہ کی نوبت نہ آئی۔ گذشتہ سال میں نے ایک صاحب کو کانپور میں اس کام کے لئے خاص طور پر متعین کیا، کامیابی نہ ہوئی پچھلی مرتبہ جب وہ کراچی میں تشریف لائے تو پھر میں نے اُن سے یہی عرض کیا۔ کہنے لگے کہ پچھلی برسات میں کچھ کتابیں خراب ہو گئی تھیں دُرست کرا رہا ہوں، اس کے بعد بھیج دوں گا۔ اب ان کے انتقال کے بعد نہ معلوم اُس کا کیا حشر ہو گا۔ ہماری بے شمار عزیز چیزیں خاص کتب خانے تباہ و

برباد ہو چکے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ اُن کو تلف ہونے سے بچانا ہمارا بہت بڑا فرض ہے۔ یہ سرمایہ دار ادارے یا حکومتیں ہی کر سکتی ہیں لیکن انھیں کیوں کر سمجھایا جائے کچھ سمجھ میں نہیں آتا میں یہ بھی کر چکا ہوں لیکن قصرِ حکومت کے راستے ایسے پیچ در پیچ اور اس میں اتنی بھول بھلیاں ہیں کہ اُن میں داخل ہو کر نکل آنا بڑے شاطر کا کام ہے۔ مجھے کامیابی نہ ہوئی۔ اپنی کوتاہی کا اعتراف کرتا ہوں۔

راز (روزنامہ امروز کراچی)

آہ عبدالرحمٰن صدیقی

۱۹۵۳ء

افسوس صد افسوس آج ہم میں سے ایک ایسا شخص اٹھ گیا جس کا بدل ملنا مشکل ہے اور شاید مدت تک نہ ملے۔ وہ راست گوئی، اخلاقی جرأت، بے باکی و آزادی میں نیک نام نہیں بدنام تھا۔ وہ کبھی کسی سے مرعوب نہ ہوا اور جس بات کو وہ سچ سمجھتا تھا اُسے وہ بڑے سے بڑے شخص کے منہ پر یا بھری مجلس میں کہنے میں باک نہیں کرتا تھا۔ وہ اگر ذرا بھی زمانہ سازی اور مصلحت کوشی سے کام لیتا تو بڑے رُتبے پر پہنچ جاتا۔ مگر ہماری نظر میں وہ اُن نام کے بڑے لوگوں سے کہیں بڑا تھا جو زمانہ سازی، چاپلوسی، منافقت اور سازش سے بڑے بڑے مناصب پر پہنچے ہیں۔ اُس نے طالب علمی میں، مرکزی کونسل کی ممبری میں، کلکتہ کی میئری میں مسلم لیگ میں، خلافت میں، کلکتہ کی مجلس وضع قوانین میں ہر جگہ سچ کی حمایت اور آزادی کی تائید کی۔ اُس نے اصول کی خاطر لڑائیاں کیں، نقصان اٹھایا، دوستوں کی ناراضی اور لیڈروں کی خفگی برداشت کی لیکن اصول کو نہ چھوڑا۔

وہ نہایت قابل شخص تھا، علم کا شائق اور علم دوست تھا۔ اس کی معلومات بہت وسیع تھیں خاص کر اسلامی ممالک کے متعلق اس کی معلومات کو دیکھ کر حیرت ہوتی تھی مصر و شام اور ترکی کے نامور لوگ اور مختلف جماعتوں کے پیشواؤں سے اُس کے ذاتی تعلقات تھے۔ وہ بڑا پُراثر اور پُرجوش مقرر تھا، اُس کی تحریر شگفتہ اور پُرزور ہوتی تھی۔ مورننگ نیوز کی اڈیٹری اس شان

سے کی کہ اب تک اس کی یاد تازہ ہے۔

انجمن ترقیٔ اُردو سے اُسے خاص لگاؤ تھا اُس نے بلا مبالغہ سخنے، قدمے دامے، مدد دینے میں کبھی دریغ نہیں کیا بلکہ سب سے آگے رہتا تھا۔ انجمن پر جب کبھی کوئی کٹھن وقت آیا تو وہ اُس کے لئے سینہ سپر ہوگیا۔ وہ انجمن کی مجلس نظما کا رکن اور اُس کے کالج کا سکریٹری تھا۔ میں نے جب کبھی انجمن کے کسی کام کے لئے چندہ کی تحریک کی تو اُس کا چندہ سب سے پہلے پہنچ جاتا تھا۔ مجھے کبھی اُس سے کہنے کی ضرورت نہ پڑی۔ وہ بے کہے اور بے طلب دیتا تھا۔ اُس نے قوم کی، انجمن کی اور دوستوں کی بے لوث خدمت کی ایسے سچے، مخلص اور ہم درد دوست کم ہوتے ہیں۔ وہ صادق القول اور واثق المحبت تھا۔ وہ مصیبت کے وقت کام آتا اور ایسی حالت میں بے طلب مدد کے لئے پہنچتا۔ اور جہاں تک امکان ہوتا وہ ہر قسم کی مدد کرتا۔ اس کی دوستی پُرانے لوگوں کی سی دوستی تھی جو دوست کے لئے ہر قسم کی تکلیف برداشت کرتے اور ہر قسم کی قربانی کے لئے تیار ہو جاتے تھے۔ وہ جس طرح دوستی میں پکا تھا اسی طرح نفرت میں بھی شدید تھا۔ یہ نفرت کسی ذاتی بنا پر نہ تھی بلکہ جو لوگ بے اصول ہوتے، ذاتی فائدے کے لئے ایمان بیچنے کے لئے تیار ہو جاتے یا قوم سے غداری کرتے اُن سے نفرت ہی نہیں اُسے سخت عداوت ہو جاتی۔ وہ ایسے لوگوں کو بھی پسند نہیں کرتا تھا جو بدتمیز یا گندے ہوتے۔ چونکہ وہ خود صاف گو تھا اس لئے غیبت کو پسند نہیں کرتا تھا خصوصاً اپنے کسی دوست کے خلاف ایک لفظ بھی سُننا گوارا نہ کرتا۔ وہ لڑتا جھگڑتا اور خفا بھی ہو جاتا تھا لیکن یہ عارضی صورت ہوتی کچھ دنوں بعد یہ کدورت دل سے محو ہو جاتی اور ویسے ہی خلوص اور محبت سے ملتا جیسے پہلے ملا کرتا تھا۔

وہ غریبوں کا ہمدرد تھا اور اُن کے کام آتا۔ اپنے ملازموں سے بہت اچھا سلوک کرتا اور اپنے سے زیادہ اُن کی آسائش کا خیال کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کے ملازم اُس کے فدائی تھے۔ اس جان لیوا بیماری میں اُس کے ملازم صدیق نے جیسی خدمت کی نہ جورو کر سکتی تھی نہ فرزند کر سکتا تھا اور نہ کوئی دوست۔ وہ اُس کی خفگی، درشتی، گالیوں اور چڑچڑے پن کو ہنس ہنس کے گوارا کرتا اور اُسے خوش رکھنے کی کوشش کرتا۔ اب اُسے ایسا آقا کہاں ملے گا۔

مجھ سے ایک ایسا دوست چھٹ گیا کہ اب ویسا ملنا ممکن نہیں۔ قوم ایک ایسے سچے، بے لوث آزاد خیال خادم سے محروم ہوگئی کہ ویسے اب اس کے حلقے میں مفقود ہیں۔

دوست اور پھر دوست بھی سچا عجب نعمت ہے یاں
ہو نہیں سکتا بدل اک دوست کا سارا جہاں

اُس کے دوستوں کو اُس کی زندہ دلی، خوش طبعی، اُس کے لطیفے اور اُس کے سفر کے عجیب و غریب واقعات اور خاص کر اُس کی پُر لطف "جدّت بھری" گالیاں بار بار اور ہمیشہ یاد آئیں گی۔ وہ جس محفل میں ہوتا وہاں بہار آجاتی اور یہ معلوم ہوتا کہ گلستاں میں بلبل چہک رہا ہے۔ افسوس اُس کے بعد احباب کی صحبتیں سونی نظر آئیں گی۔

اُس پر خدا کی رحمت ہو کہ اُس نے بہتوں کا ساتھ دیا، بہتوں کے بگڑے کام بنائے، اور بہتوں کی دوستی کا حق ادا کیا۔

(از قومی زبان)

درویش پروفیسر ری ہٹ سک

پروفیسر ایڈورڈ ری ہٹ سک جرمنی کے باشندے تھے۔ لندن میں رہ کر انگریزی زبان سیکھی اور ہندستان میں آکر عربی فارسی اور اُردُو زبانوں میں مہارت حاصل کی۔ اُن کے عربی فارسی کے اُستاد مولوی عبدالسّلام صاحب مسیحی متوطن پُل بندر کاٹھیا واڑ تھے۔ مولوی صاحب مرحوم جب تک زندہ رہے پروفیسر صاحب سے ہر سنیچر کو شام کے پانچ بجے ملنے آتے تھے۔ کچھ یہ مولوی صاحب کے لئے بحث طلب علمی مسائل جمع کر رکھتے اور کچھ وہ جمع کر لاتے اور گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے تک بہت اچھی صحبت رہتی۔ وہ مدّت تک بمبئی ولسن کالج میں ریاضی کے پروفیسر رہے۔ مگر چند وجوہ سے کالج کی ملازمت سے استعفا دیدیا اور نیٹو اوپی نین (NATIVE OPINION) نام اخبار کے اڈیٹر ہو گئے اور اس کام کو بہت خوش اسلوبی کے ساتھ آخر زندگی تک انجام دیتے رہے۔

اِنہی دِنوں میں محمڈن لٹریری سوسائٹی کلکتہ نے یہ اشتہار دیا کہ مبحث ذیل پر سب سے عمدہ مضمون کے لئے پانسو روپے انعام دیئے جائیں گے۔

"مقابلہ کرو یونانی علوم کے اثر کا جو عربوں پر خلفائے عباسیہ بغداد اور خلفائے بنو امیہ قرطبہ کے عہد میں ہوا اُس اثر سے جو عربی علوم کا زمانہ تاریک کے بعد یورپین دل و دماغ پر ہوا۔ اور اس مقابلے سے یہ نتیجہ نکالو کہ اغلباً یورپ کی موجودہ اعلا اور پختہ دماغی ترقی کا اثر مسلمانوں پر کیا ہوگا، جب کہ پھر ایک بار ہندستان میں اُن کو اس سے سابقہ پڑا ہے۔"

پروفیسر ری ہرٹے سک نے اس موضوع پر ایک محققانہ اور اعلا درجہ کا مضمون لکھا جس کی محمڈن لٹریری سوسائٹی میں بہت تعریف ہوئی خصوصاً سر چارلس ٹری ویلین اور سر ولیم میور نے اُس کا ذکر بہت پُر تحسین اور عمدہ الفاظ میں کیا۔ پروفیسر ری ہرٹے سک عربی فارسی اور اکثر السنۂ مغربی کے بڑے عالم تھے اور اُن کی تمام عمر علوم کے مطالعہ میں گذری۔ یہ انعام آخر ان ہی کو ملا۔

بمبئی کے چند نامی دولت مند مسلمانوں کی درخواست پر روضۃ الصفا خاوندشاہی اور تاریخ ابن اثیر کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ مگر ان صاحبوں نے حسب وعدہ حق السعی نہ دیا جس سے ان کو بہت رنج ہوا۔ انتقال سے دو سال پہلے۔ یہ دونوں ترجمے لندن کے ایک کتب فروش کے ہاتھ فروخت کر دیے۔ تاریخ خاوندشاہی کا چھپنا شروع ہو گیا تھا پہلے کے تھوڑے ہی صفحے دیکھنے پائے تھے کہ بیمار ہو گئے۔ یہ ترجمہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی انگلینڈ نے چھاپ کر شائع کیا ہے۔ علاوہ اس کے مہاراجہ رنجیت سنگھ کی تاریخ بھی انگریزی میں لکھی ہے۔ اور جون پور کے مہدی موعود (جن کے معتقدین کا ایک گروہ حیدرآباد دکن میں ہے) کا تذکرہ بھی لکھا اور شہنشاہ جرمنی کے نذر کیا۔ شہنشاہ نے شکریہ کے ساتھ

قبول فرما کر شاہی کتب خانے میں رکھوا دیا۔ مہدیوں کے عقائد پر بہت دلچسپ بحث کی ہے اور چند صوفی فرقوں اور یونان کے بعض فیلسوفوں کے اصول سے مقابلہ کیا ہے اور اخیر میں ان کو وجود یہ قرار دیا ہے۔

انھوں نے اور بھی تین چار کتابیں انگریزی میں لکھی ہیں۔ مصر کے مُردہ حروف کو زندہ کیا ہے اور عربی حروف سے تطبیق دی ہے۔

انھوں نے ایسی گلستاں کا ایک نسخہ بہم پہنچایا تھا جو اُن تمام نسخوں سے جدا گانہ تھا جو گلستاں کے جواب میں لکھے گئے ہیں اور جن کا ذکر مولانا حالی نے حیاتِ سعدی میں کیا ہے۔ فرانس کا ایک کتب فروش اس کا ترجمہ کرانا چاہتا تھا۔ وہ نسخہ لندن کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی میں ہے۔ ہمارے پروفیسر کا نسخہ منشی عبدالکریم صاحب کتب فروش بمبئی کے پاس ہے۔ انھوں نے منشی صاحب کے والد کو ملاحظہ کے لئے دیا تھا لندن کے کسی نقاش نے اصل کتاب کی نقل کر کے بھیجی تھی۔ چونکہ نہایت بدخط ہے اور اکثر الفاظ خلاف مروّجہ رسم الخط لکھے ہیں اور ہر صفحہ میں کم و بیش ایسے بیس۲۰ لفظ ہوں گے، اس سے پڑھنے میں سخت دشواری واقع ہوتی مگر انھوں نے بڑی عرق ریزی سے ان الفاظ کو پڑھا اور ان کی صحت کی اور صحیح الفاظ کو حاشیہ پر لکھ دیا۔

(بقیہ نوٹ صفحہ ۳۰۵)

سلہ ان کا نام سید محمد بن سید عبداللہ قادر تھا، فرقۂ مہدویہ والے ان کو میران سید محمد مہدی کہتے ہیں۔ ولادت بہ مقام جون پور ۸۴۷ھ میں ہوئی ۹۰۱ھ میں بہ مقام احمد آباد گجرات مہدویت کا دعویٰ کیا اور ۹۱۰ھ میں بہ مقام فراہ وفات پائی۔

لندن کے ایک جج کی درخواست پر فقہ اکبر کا ترجمہ بھی شروع کیا تھا۔ مگر مولوی عبدالسلام کی وفات کے بعد وہ اُسے ختم نہ کر سکے۔

ان کی زندگی بالکل راہبوں اور درویشوں کی سی تھی۔ شادی آخر عمر تک نہ کی۔ بنگلے میں اکیلے رہتے تھے۔ اور شاید دو تین مہینے میں کبھی ایک بار جھاڑ نے بہار نے اور صاف کرنے کی نوبت آتی تھی بنگلے کے پھاٹک مقفل کر کے اندر بیٹھے رہتے تھے کہ لوگ مجھے غریب سمجھ کر بلا اجازت اندر گھس آتے ہیں اور میرا وقت ضائع کرتے ہیں کسی کی دعوت قبول نہیں کرتے تھے مگر وقت پر آگئے تو کھا لینے میں مضائقہ بھی نہ تھا۔ وہ کہا کرتے تھے دعوتوں میں جانے اور بہت سے دوست پیدا کرنے میں وقت ضائع ہوتا ہے اور بہت سی فضول اور بےمصرف باتیں کرنی پڑتی ہیں۔ بجز دو تین خاندانوں کے اور کسی سے راہ و رسم نہ تھی۔ مگر جن کے ساتھ محبت تھی خلوص دل سے تھی۔ پرانی ٹوپیاں دیوار میں لٹکا رکھی تھیں۔ ان میں اپنے مسودے رکھدیا کرتے تھے جو کی روٹی اور کافی پر گزارہ کرتے اور روپیہ نہایت کفایت شعاری سے بچاتے تھے۔ مگر سب غریب بچوں کی ابتدائی تعلیم پر صرف کر دیتے۔ صبح کے نو بجے سے شام کے پانچ بجے تک لکھنے پڑھنے میں مصروف رہتے تھے۔ صرف رفع تکان کے لئے تاریل کی گڑگڑی پیتے تھے جس میں سوکھا تمباکو استعمال کرتے۔ پانچ بجے کے بعد ہواخوری کو نکل جاتے۔ ہر دن کے لئے ایک راستہ مقرر کر رکھا تھا اور یہ راہیں ایسی مقرر کی تھیں کہ سب کی سب سمندر پر جا کر ختم ہوتی تھیں۔ لب سمندر جا کر دیر تک ٹہلا کرتے۔ اس وقت کسی دوست کی رفاقت چنداں گوارا

نہ کرتے۔ جس کسی کو اُن سے علمی مسائل دریافت کرنے ہوتے تھے وہ ہواخوری کے وقت اُن کے ہم راہ ہو لیتا۔ راہ میں کھڑے رہ کر بھی کام کی باتیں کرنے میں مضائقہ نہ کرتے۔ ایک غریب طالبِ علم کو لاطینی کا سبق ہواخوری کے وقت چلتے چلتے یاد کروا دیا کرتے تھے۔ خوب صورت آدمی تھے قد لمبا تھا داڑھی ناف سے نیچے تک تھی۔ عربی فارسی بلاتکلف اس طرح بولتے تھے کہ عربوں اور مغلوں کو حیرت ہوتی تھی۔

وہ کہتے تھے کہ میرے والدین غریب تھے۔ میں نے اپنی ذاتی محنت سے علم حاصل کیا ہے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ میں کبھی بیمار نہیں ہوا اور نہ کبھی میرا سر دُکھا۔ کبھی کبھار زکام البتہ ہو جاتا ہے۔ اس سے یہ فائدہ ہے کہ دماغ صاف ہو جاتا ہے اور اخر اکتوبر میں طبیعت میں کسل اور اضمحلال رہتا تھا۔ ہندستان کے لوگوں سے انھیں بڑی محبت تھی۔ اسّی برس کی عمر میں گردوں کے عارضے سے انتقال کیا۔ اور تخمیناً بیس ہزار روپیہ اور ایک بنگلا چھوڑا اور وصیّت کر مرے کہ اس رُپے سے غربا کے بچّوں کو مفت تعلیم دی جائے۔ انھیں بچوں سے بہت محبت تھی۔ ہر شام کو بچّے اُن کے بنگلے پر جمع ہو جاتے تھے اور وہ ان کو چنے تقسیم کیا کرتے تھے۔ وہ ہر وقت ہشّاش بشّاش رہتے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ہمارے ایک دوست جن کو پروفیسر صاحب کی ملاقات کا بہت اشتیاق تھا ہمارے ایک دوسرے مہربان کے ساتھ جن سے پروفیسر صاحب کی اچھی راہ و رسم تھی، اُن سے ملنے گئے بنگلے پر جا کر دستک دی۔ ہمارے وہ دوست جو ملاقات کرنا چاہتے تھے اُس وقت سُرخ اطلس کا جبّہ پہنے ہوئے تھے۔ دستک کی آواز سُنکر

دریچے میں آکر دیکھا اور وہیں سے پکار کر کہا کہ میں سُرخ رنگ کے لباس والوں سے ملنا نہیں چاہتا۔

اس فاضل شخص کی زندگی عجیب و غریب تھی۔ اس نے تمام عمر علم کے مطالعہ اور علم کی خدمت میں صرف کی۔ گو خود درویشوں کی طرح بسر کی مگر دوسروں کو ہر طرح فائدہ پہنچایا۔ ہمارے مدارس اور کالجوں کے اُستادوں اور طالب علموں کو اس بے ریا اور بے نفس شخص کی زندگی سے سبق حاصل کرنا چاہئے۔ سچّے عالم ایسے ہی ہوتے ہیں۔

انھوں نے اپنا کتب خانہ لوگوں کے لئے وقف کر دیا جو اب دھوبی تالاب لائبریری میں محفوظ ہے۔

"افسر" ماہ جون ۱۹۰۱ء

ڈاکٹر بجنوری

۱۹۱۸ء

مرحوم بجنوری پر کچھ لکھتے ہوئے دل دُکھتا ہے، اور جب کبھی اس عزیز کا خیال آتا ہے تو دل پر عجیب کیفیت گزرتی ہے جو بیان میں نہیں آسکتی۔ یہ ہماری قوم کے اُن چند نوجوانوں میں تھے جنھوں نے یورپ کی تعلیم سے صحیح معنوں میں استفادہ کیا تھا، ورنہ اکثر یہ ہوا کہ ظاہری نمود و نمائش بے معنی اور مہمل رہیں، مذموم آداب خوشی خوشی سیکھ کر آگئے اور اسی کو سرمایۂ علم سمجھ بیٹھے۔ مرحوم یورپ میں رہے مگر مشرقی اخلاق اور تہذیب کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ مغرب سے وہ باتیں سیکھیں جو یہاں میسر نہ تھیں۔ علم و ادب سے لگاؤ انھیں پہلے سے تھا، تحقیق اور تلاش و جستجو کی لگن نے اس ذوق کو بہت پختہ کر دیا تھا۔ طبیعت بہت حساس اور نظر بہت وسیع تھی۔ دنیا کے ادبی شاہکار بہت کم ایسے ہوں گے جو اُن کی نظر سے نہ گزرے ہوں گے اس سے اُن کے ذوق میں عجیب لطافت اور وسعت پیدا ہو گئی تھی جو اُن کے مضامین سے صاف ظاہر ہے۔

تعلیم کے مسئلے سے انھیں خاص شغف تھا۔ ممالکِ یورپ کے تعلیمی طریقوں کا بڑے غور سے مطالعہ کیا تھا۔ یہاں آکر انھوں نے ایک کالج قائم کرنے کا ڈول ڈالا تھا جس میں جدید طریقوں پر صحیح تعلیم و تربیت کا انتظام ہو۔ بیگم صاحبہ بھوپال نے اس تجویز کی تفصیل سن کر اس کی سرپرستی فرمائی اور معقول رقم جمع کر دی۔ اعلیٰ حضرت حضور نظام نے بھی ایک رقم اس کے لئے عطا فرمائی۔ لیکن مرحوم کی بے وقت موت نے

اس منصوبے کو اُن کے ساتھ ہی دفن کر دیا شعیب قریشی صاحب اور عبدالرحمٰن
صدیقی صاحب اس منصوبے میں اُن کے ہم خیال اور ہم کار تھے اور ان
تینوں باہمت نوجوانوں نے اپنی زندگی اُس کے لئے وقف کر دینے کا تہیہ کر لیا
تھا لیکن کارکنانِ قضا و قدر کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ مسلم یونیورسٹی کے قیام کی
تجویز جب زیرِ بحث تھی تو ان کے مشورے بہت کارآمد ثابت ہوئے۔
جامعہ عثمانیہ کے قائم کرنے کا ڈول بھی اسی وقت ڈالا جا رہا تھا۔ دارالترجمہ
قائم ہو چکا تھا۔ مختلف فنون اور علوم پر کتابیں ترجمہ اور تالیف ہو رہی تھیں۔ ذریعہ
برسوں کی مسلسل محنت کے بعد اتنا سرمایہ ہو گیا تھا کہ میٹرکولیشن و انٹرمیڈیٹ
کی جماعتوں میں تمام مضامین اردو کے ذریعے پڑھائے جا سکیں۔ اب جامعہ کی ابتدا
ہونے والی تھی، پرنسپل کی تلاش تھی۔ بہت غور و فکر اور گفتگو کے بعد قرعہ ڈاکٹر
بجنوری کے نام پڑا۔ لیکن اس وقت جب عرض داشت بغرض منظوری اعلیٰ حضرت
حضور نظام کی پیش گاہ میں پیش ہونے والی تھی، اجل نے ہم سے اس جوہرِ قابل کو چھین لیا۔
مرحوم کبھی کبھی کسی خاص حالت یا منظر سے متاثر ہو کر شعر بھی کہتے تھے۔ ان کی
نظم شوخی کا رقص بہت مقبول ہوئی۔ نظم کے ایک ایک لفظ سے ترنت کی حرکت اور
جنبش ہویدا ہے۔ اگر نظم پڑھتے ہوئے شوخی کی ترنت کی تصویر بھی سامنے ہو تو
عجیب حال پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن شعر گوئی سے بڑھ کر ان میں سخن فہمی کا مادہ
تھا۔ غالب پر ان کی تصنیف اس کی شاہد ہے کہ انھوں نے مرزا کے اشعار کی
تشریح میں کیسے کیسے نکات پیدا کئے اور سربستہ راز آشکارا کئے ہیں۔
جب مرزا غالب کے کلام کا قدیم نسخہ جو مرزا صاحب نے بھوپال کے
فوجدار خاں کو نذر کیا تھا مرحوم کی نظر پڑا تو مارے خوشی کے بیتاب ہو گئے
اور اس اصلی نسخے کی طباعت کے لئے بڑے بڑے سامان کئے۔ اعلیٰ درجے کے

کاتب اور خاص قسم کے نفیس کاغذ کا انتخاب، طباعت کے لئے بلاکوں کا خاص اہتمام، بعض اشعار کی تشریح کے لئے چابک دست مصوّروں سے تصویروں کی فرمایش۔ اُن کا یہ انہماک دیکھ کر اُن کے بعض دوست بھی اس شاہکار کی تکمیل میں ان کے ساتھ شریک ہو گئے تھے، لیکن افسوس موت نے اتنی مہلت نہ دی اور یہ سب ٹھاٹھ یوں ہی پڑے کا پڑا رہ گیا۔

وہ دیوان بعد میں "نسخۂ حمیدیہ" کے نام سے شائع ہوا جیسے اور کتابیں معمولی طور پر شائع ہوتی ہیں۔ جو بات ڈاکٹر بجنوری چاہتے تھے وہ کسی دوسرے کے بس کی نہ تھی۔

ڈاکٹر عبدالرحمان کی ذہانت، جودتِ طبع، وسیع نظری اور علم و فضل کو دیکھ کر دل میں عزت و احترام پیدا ہوتا تھا۔ لیکن جب اُن کے اخلاق پر نظر ڈالئے اور ان کی شرافتِ نفس، عالی ظرفی، رواداری، انکسار، ادب اور شفقت، دوستی اور محبت، حیا اور خودداری کو دیکھتے تھے تو دل بے اختیار ان کی طرف کھنچتا تھا اور ان سے محبت ہونے لگتی تھی۔ اُن کے اخلاق کو دیکھکر غیر بھی اپنے ہوجاتے تھے۔ ان کے مذہب میں دل آزاری کفر تھی۔ لیکن رائے کی آزادی میں وہ سب سے آگے تھے۔

ایسے جوہرِ قابل کا عین عالمِ شباب میں اُٹھ جانا اس کے خاندان اور اس کے احباب ہی کے لئے ایک المناک حادثہ نہ تھا، بلکہ درحقیقت ایک قومی سانحہ تھا۔ اس کا دل اور دماغ بہت لطیف اور نازک تھا۔ وہ ایک نازک پودا تھا جو سمومِ زمانہ کی تاب نہ لاسکا اور وقت سے پہلے اِس دنیا سے منہ موڑ کر چلا گیا۔

(یادگار بجنوری ۱۹۵۱ء)

نواب عماد الملک

(مولوی سید حسین بلگرامی)

اٹھارہویں صدی میں ہندستان کو ایک نئی قوم اور ایک نئی تہذیب سے سابقہ پڑا۔ یوں تو یورپ سے سب سے پہلے پرتگالی آئے اس کے بعد ولندیزی اور فرانسیسی۔ لیکن ان کا کوئی زیادہ اثر ملک پر نہیں ہوا۔ پرتگالی ہندستان میں دو مقصد سے آئے تھے۔ مسالوں کی تجارت سے روپیہ کمانے اور عیسائی مذہب پھیلانے۔ ان دونوں مقصدوں کے حصول میں انھوں نے بڑے ظلم و جبر اور سفاکی سے کام لیا۔ ان کی یادگار اب ان کے کچھ لفظ اور کچھ دیسی عیسائی اور کچھ دوغلے مرد و زن باقی رہ گئے ہیں۔ ولندیزوں اور فرانسیسوں کا کوئی قابل ذکر نشان باقی نہ رہا۔ البتہ انگریزوں کے قدم یہاں ایسے جمے کہ وہ اکاس بیل کی طرح سارے ملک پر چھا گئے۔

ان سے قبل جتنے فاتح ہندستان میں آئے وہ شمال مغرب کی طرف سے داخل ہوئے۔ مگر یہ یورپی قومیں سمندر کے راستے تجارت کے بھیس میں آئیں اور تجارت کی کوٹھیاں بناتے بناتے قلعے بنانے اور لشکر جمع کرنے لگیں۔ اورنگ زیب عالمگیر کے بعد سلطنت دہلی میں انحطاط شروع ہو گیا تھا۔ رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ بادشاہ صرف نام کے بادشاہ رہ گئے صوبے خود مختار ہو گئے۔ یہ کبھی آپس میں لڑ مرتے کبھی غیروں کی مدد سے

ایک دوسرے پر حملے کر بیٹھتے کبھی مل کر غیروں سے جا بھڑتے اور کبھی غداری کر کے خود اپنی جڑ کاٹنے پر آمادہ ہو جاتے۔ انگریز ان حالات کا ایک شاطر کی طرح مطالعہ کرتا رہا۔ اور کبھی موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ کبھی ایک کے ساتھ ہو گیا اور دوسرے کو شکست دی اور اس کمک کے معاوضے میں مصارف کے نام سے گراں قدر رقم لے لی اور کچھ حصہ ملک کا بھی ہتھیا لیا کبھی کسی کو بڑھتا ہوا دیکھ کر چھیڑ خانی شروع کر دی اور اس کے حریفوں سے مل کر اس کے علاقے پر چڑھائی کر دی۔ اور بندر بانٹ کے قدیم اصول پر اچھا حصہ اپنے لیے رکھ لیا اور منہ بھرائی کے طور پر ایک ٹکڑا ساتھیوں کے سامنے ڈال دیا۔ کبھی بادشاہ سے فرمان حاصل کر کے مقبوضہ علاقے کے قبضے کو جائز قرار دے لیا ہمارے اسلاف ان فرنگیوں کو کبھی خاطر میں نہ لائے۔ ان کا لباس کھانا پینا، رہنا سہنا، عادات و اطوار، ان کی زبان غرض ان کی ہر بات ان کی نظروں میں اجنبی، نامانوس اور ناشائستہ تھی۔ ہمارے ایک سرگزشت نویس نے فرنگی کی عجیب و غریب تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔

"یکے از جانوران دریائی کہ گاہ گاہ بہ ساحل نمودار می شود۔"

اس میں "گاہ گاہ بہ ساحل نمودار می شود" کا کلمہ خاص طور پر قابل غور ہے ہمارے بزرگ زیادہ سے زیادہ ان کی تعریف یہ کرتے تھے کہ کاریگر اچھے ہیں، بندوق توپ گھڑی وغیرہ خوب بنانا جانتے ہیں۔ صاحب علم نہیں۔ وہ بھی مسلمانوں سے خوش نہ تھے اور اپنا وفادار خیال نہیں کرتے تھے بلکہ باغی سمجھتے تھے۔ ان کا ایسا سمجھنا کچھ بے جا نہ تھا اس لیے کہ سلطنت انھوں نے مسلمانوں سے لی تھی مسلمانوں سے بدگمان تھے اور بدگمان رہے۔ انھوں نے ابتدا ہی سے مکر و فریب حیلہ سازی اندرونی سازشوں اور حکمتوں سے اپنا تسلط بڑھایا اور خاص کر

اسلامی حکومتوں سے جو معاندانہ برتاؤ کیا اس نے مسلمانوں کے دلوں میں اُن کی طرف سے نفرت پیدا کر دی۔ ان کے چہیتے اول درجے میں پارسی اور دوسرے درجے میں ہندو تھے۔ مسلمانوں کو اپنے اعتقادات، تہذیب و روایات اور علم و فضل پر غرّہ تھا۔ وہ اس ملک کے فاتح اور حاکم تھے۔ انھوں نے ایک نئی تہذیب کی بنیاد ڈالی تھی جس نے ملک کی کایا پلٹ دی تھی اور باوجود زوال سلطنت کے انھوں نے اپنی انفرادیت کو قائم رکھا اور انگریز کے سامنے نہیں جھکے۔ وہ اسے حقیر اور نجس سمجھتے رہے۔

ہر دور کا ایک تقاضا ہوتا ہے۔ اس تقاضے کو سمجھنا اور سمجھ کر اپنے ماحول اور حالات کی رو سے اپنی تنظیم کرنا اس کارزار حیات میں سنبھلے رہنے اور کامیاب ہونے کے لئے ضروری ہے۔ ہندو اس راز کو سمجھتے تھے وہ اپنے ملک میں ایسے کئی دور دیکھ چکے تھے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے یہ پہلا موقع تھا۔ انھوں نے اس کی پروا نہ کی اور بالآخر اس کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ مسلمانوں میں دو چار خاندان ایسے تھے جنھوں نے اس کش مکش کے ابتدائی دور میں زمانے کے تیور پہچانے اور اپنی حیثیت اور وقار قائم رکھنے کے لئے بڑھے اور زمانے کے ساتھ دینے میں کچھ پس و پیش نہ کیا۔ ان میں ایک مولوی سید حسین بلگرامی کا خاندان تھا جس نے ہوا کا رخ دیکھ کر انگریزی حکومت کا تقرب حاصل کیا۔

بلگرام اودھ کا نہایت مردم خیز قصبہ ہے۔ اس خاک سے ایسے جلیل القدر عالم و فاضل اٹھے جن کے نام اپنے تبحر اور علم و فضل کی وجہ سے علمی دنیا میں ہمیشہ یادگار رہیں گے۔ سید حسین کے دادا سید کرم حسین کو انگریزی توسل حاصل ہوا اور وہ بہ عہد نصیر الدین حیدر بادشاہ اودھ ۱۲۴۳ --- ۱۲۵۲ھ سرکار اودھ کی طرف سے سفیر ہو کر کلکتے گورنر جنرل لارڈ بنٹنک کے دربار میں پہنچے۔ ان کی اولاد سید زین الدین [illegible]

(والد سید حسین) اور سید اعظم الدین حسین نے وارن ہیسٹنگز کے بناکردہ مدرسہ عالیہ میں علوم مشرقیہ کی تکمیل کی اور ایسے زمانے میں جبکہ انگریزی پڑھنا حرام سمجھا جاتا تھا، انگریزی بھی سیکھی۔ یہ پہلے مسلمان شریف زادے تھے جو اس بدعت کے مرتکب ہوئے اور باقاعدہ انگریزی تعلیم حاصل کی۔

سید حسین کے چچا اعظم الدین حسین نے انگریزی حکومت میں بڑا اعزاز اور اعتماد حاصل کیا اور بڑی ذمہ داری کی خدمات پر مامور رہے۔ ابتدا میں لارڈ ڈلہوزی کے اے ڈی کان اور ترجمان رہے۔ اس کے بعد وہ سندھ میں حکومت کی طرف سے بطور سفیر یا پولیٹکل ایجنٹ امیران سندھ وا فسر جہاز رانی دریائے سندھ متعین ہوئے یہ عہدہ انگریزوں کے لئے مختص تھا۔ مگر امیران سندھ اپنے ملک میں انگریز کا آنا پسند نہ کرتے تھے۔ سندھ میں سیدوں اور پیروں کی بے حد تعظیم و تکریم کی جاتی ہے۔ اس لئے وہاں کے لوگ ان کا بہت احترام کرتے ہاتھ چومتے اور قدم لیتے۔ نواب عماد الملک فرماتے تھے کہ وہ کبھی کسی کے سامنے انگریزی کتاب نہ پڑھتے تاکہ لوگوں کو بدگمانی نہ ہو۔ اکثر سندھی ان کی خدمت میں تعویذ لینے کے لئے حاضر ہوتے تھے۔ اس لئے جب کبھی کوئی عربی شعر یاد آتا یا آیت قرآنی تو وہ کاغذ پر لکھ کر ایک ٹوکری میں ڈال دیا کرتے تھے جب لوگ تعویذ مانگنے آتے وہ اس ٹوکری میں سے نکال نکال کر دیدیا کرتے۔ کچھ عرصے کے بعد کسی بدنفس نے یہ افواہ پھیلادی کہ یہ شخص درصل انگریز ہے مسلمان بنا ہوا ہے۔ آدمی تھے گورے چٹے لوگوں کو یقین آگیا اور شورش برپا ہوگئی۔ اس سے ان کو جان کا خطرہ ہوگیا اور وہ راتوں رات جہاز میں بیٹھکر نکل بھاگے۔ اس کے بعد وہ ڈپٹی کلکٹر و ناظم بندوبست بہار چوبیس پرگنہ کی خدمت پر مامور ہوئے۔ دربار یعنی لیٹو کونسل بنگال کے ممبر نامزد ہوئے۔ حکومت نے سی۔ ایس۔ آئی کا خطاب عطا کیا۔

سیّد اعظم الدین حسین کے دوسرے بھائی سید زین الدین حسین نے محکمۂ مال میں ملازمت اختیار کی ۔ ۱۸۴۰ء میں ڈپٹی کلکٹر اور ڈپٹی مجسٹریٹ کے عہدے پر فائز ہوئے ۔اس ملازمت کے دوران میں انھیں ایک مدت تک اضلاع بہار و بنگالہ میں رہنے کا اتفاق ہوا ۔چنانچہ مولوی سید حسین کی ولادت بھی بہاتما بدھ کی جنم بھومی ضلع گیا کے قصبہ صاحب گنج میں ہوئی ۔سیّد صاحب ۱۸۷۵ء میں پنشن لے کر ملازمت سے سبکدوش ہو گئے ۔

مولوی سیّد حسین کی ابتدائی تعلیم گھر ہی پر ہوئی ۔ابھی چھے سات برس کے تھے کہ ان کو عربی شروع کرائی گئی ۔وہ کہتے تھے کہ میری تعلیم کی ابتدا عربی زبان سے ہوئی ۔حتاکہ حساب اور اقلیدس بھی عربی میں پڑھی ۔چودہ برس کی عمر میں وہ فارسی عربی کی تحصیل سے فارغ ہو کر بھاگلپور ،پٹنہ اور بعدازاں کلکتے کے انگریزی مدارس میں تعلیم پاتے رہے ۔۱۸۶۱ء میں میٹرکولیشن کی سند حاصل کی ۔ ۱۸۶۶ء میں درجہ اول میں آنرز کے ساتھ بی ۔ اے میں کامیابی حاصل کی ۔ان کے والد کی خواہش تھی کہ وہ اپنے اثر سے کسی معقول سرکاری ملازمت میں منسلک کر دیں لیکن نوجوان سیّد نے جو کالج کے کمروں سے تازہ تازہ نکلا تھا اپنے علمی ذوق کی بنا پر اس سر رشتے کو پسند کیا جو تمام سرکاری سر رشتوں میں کم حیثیت سمجھا جاتا ہے اور ایک صدی گزرنے پر بھی اب تک ناقدردانی کا شکار ہے ۔اس نے ڈپٹی کلکٹری پر معلمی کو ترجیح دی اور کیننگ کالج لکھنو میں عربی زبان کی پروفیسری قبول کر لی ۔ اور اس طرح انھیں لکھنؤ میں مستقل طور پر رہنے کا موقع مل گیا ۔

اس دوران میں ان کو لکھنو کی معاشرت اور وہاں کی تہذیب و آداب و اشغال اور مذہبی رجحانات دیکھنے کا اچھا موقع ملا اور وہاں کے علما و اکابر کی صحبتوں سے مستفید ہوئے ۔اس زمانے میں لکھنؤ شعر و سخن اور خاص کر مرثیہ گوئی کا مرکز تھا ۔

ان تمام باتوں کا ایک قابل تعلیم یافتہ نوجوان پر اثر ہونا ضرور تھا۔ پروفیسری کے زمانے میں انھیں لکھنؤ ٹائمز کی اڈیٹری کے فرائض بھی انجام دینے پڑے۔ یہ اخبار تعلقداران اودھ کے مفاد و اغراض کی حمایت کے لئے جاری کیا گیا تھا۔ اس زمانے میں گورنمنٹ نے نہر سردہ نکالنی چاہی۔ اس سے تعلقداران اودھ کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا اس لئے تعلقدار اس تجویز کے سخت مخالف تھے۔ اخبار پانیر نے (جو نیم سرکاری اخبار سمجھا جاتا تھا) اس تجویز کی تائید میں پر زور آرٹیکل لکھے۔ لکھنؤ ٹائمز کے نوجوان اڈیٹر نے ان مضامین کا جواب لکھا اور گورنمنٹ کی تجویز پر سخت نکتہ چینی کی۔ ایسی نکتہ چینی اور وہ بھی تعلقداران اودھ کے اخبار میں حکومت کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ پروفیسر سید حسین معرض عتاب میں آگئے اور انھیں اڈیٹری سے دست بردار ہونا پڑا۔ اب ان کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ نواب سر سالار جنگ بہادر لارڈ نارتھ بروک کی ملاقات کے لیے کلکتہ تشریف لے گئے۔ وہاں سے واپسی میں سیر و سیاحت کرتے ہوئے لکھنؤ وارد ہوئے۔ گورنمنٹ آف انڈیا نے ان کی مہانداری اسی شان سے کی جیسی خود مختار رؤسائے عظام کی کی جاتی تھی۔ کل گورنران صوبجات ہند کو حکم پہنچ گیا تھا کہ ان کو اپنا مہمان سمجھیں چنانچہ اسی غرض سے رزیڈنٹ وقت مسٹر سانڈرس ہم رکاب تھے۔ لکھنؤ میں نواب صاحب جنرل ایل بیرو چیف کمشنر کے ہاں فروکش ہوئے۔ جنرل بیرو نے تعلقداران اودھ و دیگر امرائے شہر سے ملاقات کرائی منجملہ ان کے پروفیسر سید حسین کا تعارف بھی نواب صاحب سے کرا دیا اور ان کی علمی ادبی قابلیت کی بہت کچھ تعریف کی۔ نواب سر سالار جنگ بہادر بہت مردم شناس اور قدردان تھے اور ان اصلاحات کے پیش نظر جو وہ حیدرآباد کی ریاست میں کرنا چاہتے تھے ان کی یہ تمنا تھی کہ ہندستان کے قابل اور تجربہ کار اشخاص کو اپنی ریاست میں کھینچ لائیں چنانچہ سید حسین سے ملنے کے بعد ان کو ریاست کی

ملازمت کی ترغیب دی اور فرمایا کہ میں جب حیدرآباد واپس پہنچوں تو تم ضرور آؤ اور مجھ سے ملو۔ لیکن وہ حیدرآباد نہ گئے۔ ایک وجہ تو یہ تھی کہ فطرتاً ان کے مزاج میں استغنا تھا اور اس کا کچھ خیال نہ کیا۔ دوسری وجہ غالباً یہ معلوم ہوتی ہے کہ لوگ ریاست کی نوکری کو انگریزی ملازمت کے مقابلہ میں کم تر اور ناقابل اعتبار سمجھتے تھے۔ نواب سر سالار جنگ کو اس کی بڑی شکایت تھی اور جب وہ اس قسم کی کوئی بات سنتے تھے تو انھیں رنج ہوتا تھا کیونکہ انھوں نے اپنی ریاست کو منظم اور باضابطہ بنانے میں بڑی حکمت اور تدبر سے کام لیا تھا اور اس کام میں انھیں ایسی مشکلات سے مقابلہ کرنا پڑا جن کا اس وقت تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ آخر خود نواب صاحب ہی نے اصرار کر کے بلوا بھیجا۔ اس کے بعد بھی پس و پیش کرتے رہے اور آخر ۱۸۷۳ء میں حیدرآباد آئے۔ اور آئے بھی تو تین مہینے کی رخصت لے کر۔ حیدرآباد پہنچے تو نواب سر سالار جنگ نے ان کے حال پر اس قدر شفقت اور عنایت فرمائی کہ وہ ہمیشہ کے لئے یہیں کے ہو گئے۔

ابتدا میں نواب صاحب نے انھیں اپنا پرسنل اسسٹنٹ (مددگار پیشی) بنایا۔ یہ خدمت بڑے اعتماد کی تھی۔ ریاستوں کے ساتھ برٹش گورنمنٹ کا یہ معاہدہ تھا کہ وہ کسی انگریز کو بغیر اجازت گورنمنٹ آف انڈیا ملازم نہیں رکھ سکتے۔ اس وقت حیدرآباد میں انگریزی معتمد (سکریٹری) ایک انگریز مسٹر اولی فینٹ تھا۔ گورنر جنرل ڈلہوزی جو دیسی ریاستوں کا سخت مخالف تھا اور کئی ریاستوں کو ہڑپ کر چکا تھا اس نے اس بنا پر کہ حیدرآباد کنٹنجنٹ کے مصارف کی رقم کئی سال سے ادا نہیں ہوئی تھی ریاست کے زرخیز علاقہ برار پر عارضی قبضہ کر لیا تھا۔ حضور نظام ان کے امرا اور اہل حیدرآباد کو اس کا بہت صدمہ تھا اور یہ داغ ایسا تھا جو دولت آصفیہ کے دل پر آخر دم تک رہا۔ اور ہر چند اس داغ کے مٹانے کی کوشش کی مگر زبردست سے اور روئے

نہ ہونے کا معاملہ تھا کامیابی نہ ہوئی۔ سر سالار جنگ نے اس مہم کا آغاز کیا۔ ان کی سب سے بڑی یہ آرزو تھی کہ یہ علاقہ انگریزی گورنمنٹ سے واپس لے لیا جائے۔ ان باتوں سے انگریزی گورنمنٹ بہت بگڑتی تھی۔ نواب سالار جنگ نے غدر کے زمانے میں انگریزی حکومت کے بچانے میں جو بے نظیر مدد کی تھی وہ ایسا بڑا احسان تھا کہ انگریز ان پر ہاتھ ڈالتے ہوئے جھجکتے تھے ورنہ کبھی کے ختم کر دیئے جاتے۔ برار اور اسی قسم کے دیگر اہم معاملات کے متعلق مراسلت انگریزی میں ہوتی تھی اور سیکرٹری مسٹر اولی فینٹ انگریزی حکومت کو ترکی بہ ترکی جواب دیتے تھے۔ نزلہ بر عضو ضعیف، ان پر برٹش گورنمنٹ کا عتاب نازل ہوا اور ان کو حیدرآباد چھوڑنا پڑا۔ مولوی سید حسین ان کے شریک معتمد (جائنٹ سیکرٹری) تھے گویا شریک جرم تھے۔ حیدرآباد میں جب یہ افواہ پھیلی کہ مولوی سید حسین بھی معرض عتاب میں ہیں اور چند روز کے بعد نکال دیئے جائیں گے تو نواب سالار جنگ نے سن کر فرمایا کہ سید حسین کے نکالے جانے سے پہلے میں خود اپنے عہدے سے استعفا دیدوں گا۔ اس سے نواب صاحب کی کمال قدردانی کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ مولوی سید حسین کو بہت عزیز رکھتے تھے اور ان پر کامل اعتماد کرتے تھے۔ ان کا حکم تھا کہ کوئی انگریزی مراسلہ اس وقت تک جاری نہ کیا جائے جب تک مولوی سید حسین کی نظر سے نہ گزر جائے۔

۱۸۷۶ء میں نواب صاحب نے یورپ کا سفر کیا تو مولوی سید حسین ان کے ہم رکاب تھے۔ واپسی پر مولوی صاحب کو اپنا پرائیویٹ سیکرٹری اور معتمد صیغہ متفرقات مقرر فرمایا جس میں سررشتہ تعلیم اور بعض چھوٹے موٹے محکمے شامل تھے۔ جب ۱۸۸۴ء میں حضور نظام (میر محبوب علی خاں) مسند نشین ہوئے اور میر لائق علی (عماد السلطنۃ) مدار المہامی پر سرفراز ہوئے تو ایک کونسل آف اسٹیٹ کا قیام عمل میں آیا جس کا مقصد اہم معاملات حکومت میں مشورہ دینا تھا۔ اس مجلس کے

معتمد (سیکریٹری) مولوی سید حسین قرار پائے۔ اس کونسل کے میر مجلس خود اعلیٰحضرت (میر محبوب علی خاں) تھے۔ اس سال جشن نوروز میں ان کو علی یار خاں مؤتمن جنگ کا خطاب عطا ہوا اور ۱۸۸۶ء میں بتقریب جشن نوروز عماد الدولہ اور ۱۸۹۰ء میں سالگرہ مبارک کے موقع پر عماد الملک کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔

کرنل مارشل کی علیحدگی کے بعد ۱۸۸۹ء (۱۳۰۶ھ) میں مولوی صاحب اعلیٰحضرت کے پرائیویٹ سیکریٹری مقرر ہوئے۔ اعلیٰحضرت نے دست مبارک سے (اپنی زبان میں) ایک رقعہ مولوی صاحب کو لکھا جس کے الفاظ یہ ہیں۔

"نواب عماد الملک بہادر۔ آپ کے واسطے خدمت خانگی پرائیویٹ سیکریٹری کی مقرر کیا ہوں جو اس خدمت کے واسطے کسی کو نہ سمجھا۔ ایسا قابل شخص انگریزی فارسی اردو اور بات کو مخفی رکھنے والا۔ اور جو اس خدمت کی کارروائی ہوئی گی وہ آپ پاس لکھ کر بھجوادوں گا یا خود آؤں گا مگر آپ کل دس بجے صبح میں اکثر نذر دینا۔ (دستخط یا محبوب) ۱۰ جمادی الثانی ۳۰۶ھ روز دو شنبہ شب سہ شنبہ"

چند سال کے بعد ۱۹۰۲ء میں دوسرے مناصب سے کنارہ کش ہو کر وہ صرف ناظم تعلیمات (ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن) ممالک محروسہ سرکار عالی کے عہدے پر متمکن رہے، اور آخر تک اسی عہدے پر فائز رہے۔ اگرچہ بعض اوقات اس سے بڑے مناصب پر سرفراز کئے گئے لیکن انھوں نے نظامت تعلیمات کو کبھی نہ چھوڑا اور ہر حال میں اپنے ساتھ لگائے رکھا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ انھیں بالطبع تعلیم اور علم وادب سے خاص لگاؤ تھا۔ دوسرے وہ یہ سمجھتے تھے کہ بڑے عہدوں پر للچائی ہوئی نظریں پڑتی ہیں اور اقتدار کے بھوکے سفارشوں اور سازشوں کی مدد سے ان کے حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اہلیت و نااہلیت کوئی نہیں دیکھتا۔ نظامت تعلیمات ایک معمولی عہدہ ہے تنخواہ بھی زیادہ نہیں اور قوت واقتدار بھی واجبی ہی واجبی ہے بلکہ نہ ہونے کے

برابر ہو۔ دوسرے یہ عہدہ دوسرے فوائد سے بھی محروم ہو۔ باوجود اس کے نواب عماد الملک کا وقار بوجہ علم و فضل اور اعلا سیرت کے ایسا تھا کہ ان کے اعلا افسر اور بڑے بڑے امرا و وزرا ان کا احترام کرتے تھے۔ وہ تقریباً ۲۲ سال تک دوسری خدمات کے ساتھ بلا وقفہ اس عہدے پر رہے۔ ریاست حیدرآباد میں باقاعدہ تعلیم کی بنیاد آپ ہی نے رکھی اور سررشتہ تعلیم کی جدید تنظیم آپ ہی کے ہاتھوں ہوئی۔ مدارس اور طلبہ میں بہت کافی اضافہ ہوا۔ علاوہ اس فرض منصبی کے انکے اثر اور صحبت سے حیدرآباد میں علمی ذوق کو بہت فروغ ہوا۔ صنعت و حرفت کے مدارس بھی ریاست میں آپ ہی نے قائم کئے۔ دیسی صنعت کے بڑے قدردان تھے۔

حیدرآباد میں ان کے علمی ذوق کی دو بڑی قابل یادگاریں ایسی ہیں جن کی افادیت اور اہمیت کبھی کم نہ ہوگی۔ ایک کتب خانہ سرکار عالی اور دوسرا دائرۃ المعارف۔ اس کتب خانہ کے لیے مطبوعہ کتب کے علاوہ نادر اور کمیاب قلمی کتابیں ایسی جمع کیں کہ اسکا شمار اس برعظیم کے بہترین کتب خانوں میں ہوگیا۔ یہ نادر مخطوطات زیادہ تر عربی زبان کی ہیں۔ ان میں سے بعض ایسی ہیں کہ جن کا کوئی دوسرا نسخہ دنیا کے کسی کتب خانے میں نہیں۔ قلمی کتاب کی دوسری چیزوں کی طرح کوئی خاص قیمت نہیں ہوتی۔ یہ قدردانی پر ہے۔ بعض وقت سودا کرنے میں انمول کتاب ہاتھ سے جاتی رہتی ہے اور اس کا پچھتاوا عمر بھر رہتا ہے۔ نواب عماد الملک کتاب کے بڑے قدردان تھے اور اس قدردانی کا نتیجہ تھا کہ جب کوئی ایسی کتاب آگئی تو لئے بغیر نہ چھوڑتے اور منہ مانگی قیمت دیتے۔ اس فیاضی کی بدولت کتاب فروش یا جن کے پاس کوئی اچھی یا نادر کتاب ہوتی ان کی خدمت میں حاضر ہوتے جو لوگ کتاب کی قدر و قیمت سے واقف نہیں وہ اس پر بہت جھنجھلاتے اور اسے اسراف سے منسوب کرتے اور طعن کرتے کہ مولوی صاحب سرکاری روپیہ ان چیزوں پر ضائع کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک بار انھوں نے چار پانچ عربی کتابیں

آٹھ ہزار روپیہ میں خریدیں اور جب رقم کی منظوری کے لیے مطلوبہ مدار المہام سرکار عالی (نواب وقار الامرا) کی خدمت میں پیش ہوا تو کسی صاحب نے چپکے سے کہہ دیا کہ سرکار مولوی سید حسین صاحب کی عادت ہے کہ وہ کتابیں خریدنے میں سرکاری روپیہ بیدردی سے خرچ کرتے ہیں اور جو جتنی قیمت مانگتا ہے دیدیتے ہیں۔ نواب عماد الملک کو بھی اسکی سن گن پہنچ گئی۔ انھوں نے مدار المہام سے کہا کتابیں واپس فرمادی جائیں میں انھیں خود خریدوں گا اور یورپ بھیج کر اس سے چار گنا قیمت وصول کروں گا مدار المہام نواب وقار الامرا نے جو بہت با مروت فیاض اور چشم امیر تھے بہت معذرت کی اور فوراً رقم ادا کرنے کا حکم صادر فرمایا۔ ایک ایسا ہی واقعہ میرے سامنے پیش آیا۔ نواب عماد الملک نے کچھ کتابیں خریدیں اور رقم منظوری کے لئے ہوم آفس کو لکھا سررشتہ تعلیمات ہوم آفس کے ماتحت ہے۔ اس وقت ہوم سیکریٹری افضل العلما نواب سربلند جنگ (حمید اللہ خان فرزند مولوی سمیع اللہ خاں) تھے۔ انھوں نے دیکھا کہ بعض کتابیں جو مطبع نول کشور سے چند روپے میں مل سکتی ہیں ان کی قیمت ڈیڑھ ڈیڑھ اور دو دو سو روپے لکھی ہے تو انھیں تعجب ہوا اور لکھا کہ کتابیں ملاحظہ کے لئے بھیج دی جائیں۔ نواب عماد الملک نے لکھا کہ کتابیں کسی کے پاس نہیں جاتیں جسے دیکھنا ہو یہاں آکر دیکھے۔ ہوم سیکریٹری صاحب نے بے چون وچرا منظوری دے دی۔ نام کے افضل العلما صاحب کیا جانیں کہ ایک کتاب جو بازار میں دو چار روپے میں مل جاتی ہو وہی کتاب اگر مصنف کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہو یا اسکا کوئی قدیم صحیح نسخہ مل جائے تو اسکی قدر و قیمت کس قدر بڑھ جاتی ہے۔ اس طرح نواب عماد الملک نے نایاب کتابوں کا بڑا اچھا ذخیرہ سرکاری کتب خانہ میں جمع کر دیا۔

علمی لحاظ سے نواب صاحب کا دوسرا بڑا کام دائرۃ المعارف کا قیام ہے۔ اسکا مطبع بھی ہے۔ اس ادارے نے عربی کی بہت سی نادر کتابیں طبع وشایع کی ہیں۔ یہ ایسی کتابیں ہیں جن کے قلمی نسخے نایاب تھے اور دو ایک سے زیادہ دنیا میں کسی دوسری جگہ نہیں پائے

جاتے تھے۔ ان کی قدر اور شہرت ہندستان سے زیادہ عرب ممالک اور بلاد یورپ میں ہوئی اس ادارے کا قیام ۱۳۰۲ھ (۱۸۸۶ء) میں ہوا اس وقت پانسو روپے ماہانہ اسکے مصارف کے لئے مقرر ہوئے۔ اسکے بعد نواب صاحب کی تحریک پر اعلاحضرت نے ۱۳۴۹ھ (۱۹۲۱ء) میں اسے ایک لاکھ روپیہ اور ایک سال کے بعد پانچ لاکھ روپے عطا فرمائے۔ بھارت کے غاصبانہ قبضے کے بعد ریاست حیدرآباد پر جو آفات نازل ہوئیں ان میں دو ایسی ہیں جن کا صدمہ کبھی نہیں بھول سکتے۔ ایک عثمانیہ یونیورسٹی کی تخریب اور دوسری دائرۃ المعارف کا خاتمہ۔ افسوس نواب عماد الملک کی یہ بے نظیر علمی یادگار ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئی لیکن اس نے جو قابل قدر کام کیا ہے وہ ہمیشہ یادگار رہے گا اور کبھی نہیں مٹ سکتا۔

نواب صاحب کو عربی زبان سے بے حد محبت تھی۔ دائرۃ المعارف اسی محبت کا نتیجہ تھا۔ مولوی عبدالحلیم شرر لکھتے ہیں۔

"مجھے ایک مدت تک بالذات ان کی روزانہ صحبتوں میں شریک ہونے کی عزت حاصل رہی ہے اور ان کے طالب علمانہ مشاغل میں شریک ہو کر میں نے انکے علم و فضل سے فائدہ اٹھایا ہے۔ اسی سلسلے میں مجھے انکی واقفیت عامہ ان کے مذاق اور ان کے اسلوب زندگی کے اندازہ کرنے کا بخوبی موقع ملا۔ شعرا کے کلام کا مطالعہ کرنے میں چند روز میں ان کے ساتھ شریک رہا۔ اور نظر آیا کہ جیسی محققانہ و مبصرانہ نظر کلام عرب پر ان کی پڑتی ہے بہت کم کسی کی پڑتی ہے۔ سچ یہ ہے کہ یہ نہیں ادب عربی میں یکتائے روزگار پایا جاتا ہے عرب کے سانچے اور خاص عربی مذاق کے دلدادہ ہیں۔ شعرائے جاہلیت کے کلام پر سر دھنتے ہیں اور مولدین کے کلام کو بالکل نہیں پسند کرتے"۔

حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے خطبۂ صدارت میں آپنے جامعۂ عثمانیہ کے ذکر کے دوران میں عربی زبان کی تعلیم کی خاص طور پر تاکید کی ہے۔ فرماتے ہیں۔

دوسرا امر جس کی طرف کار پردازان جامعہ علمیہ کی توجہ مبذول ہونی چاہئے۔

وہ یہ ہے کہ اس جامعہ کے مسلمان طلبہ بطور دوسری زبان تعلیمی کے عربی کے اختیار کرنے پر مجبور کئے جائیں۔ ۔ ۔ اگر فقط اردو انگریزی پر اکتفا کیا گیا تو بجز ناکامی کے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ دوسری یونیورسٹیوں کے کامیاب طلبہ سے آپ کے کامیاب طلبہ پیچھے رہ جائیں گے اور آپ کی ساری محنت اکارت جائے گی۔ طلبہ کو وہ پایۂ فضیلت نصیب نہ ہوگا جس کی ان کو اور ہم کو اور ان کی قوم کو ضرورت ہے۔ عربی زبان کو مختلف حیثیتوں سے ہم مسلمانوں پر حق تحکم حاصل ہے" اس کے بعد اس کی تفصیل بیان کی۔

میں نے اورنگ آباد میں کالج قائم کرنے کی تجویز کی تھی۔ نواب صاحب کی تائید و تحریک سے جلد منظوری حاصل ہو گئی۔ قیام کالج کے بعد آپ نے ان طلبہ کے لیے وظیفے مقرر کئے جنھوں نے عربی زبان لی تھی۔ اور ہر سال بغیر یاد دہانی یا تقاضے کے وقت پر میرے پاس چیک آجاتا تھا۔

مولوی حبیب الرحمان خان شیروانی (نواب صدر یار جنگ) مرحوم نے نواب صاحب کے علم و ادب کے شغف کے متعلق اپنی ایک تقریر میں یہ واقعہ بیان فرمایا۔

جس سال آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس گجرات میں منعقد ہوئی وہاں پرانی علمی کتابوں کی تباہی دیکھ کر میں نے ایک اپیل شائع کی کہ روپے کی امداد دے کر ان کتابوں کے خریدنے اور محفوظ کرنے کا انتظام کیا جائے۔ نواب عماد الملک بہادر مرحوم نے اپیل پڑھ کر خط لکھا کہ اپیل پڑھ کر کتابوں کی تباہی پر میں رو رہا ہوں۔ افسوس ہے کہ اس وقت میرے پاس روپیہ نہیں اس لئے ایک ہزار روپے کا چیک پیش کرتا ہوں"۔ یہ تھی مرحوم کی کریم النفسی اور علم شیفتگی۔

وہ اس قسم کے تمام علمی کاموں میں بڑی خوشی کا اظہار کرتے اور فیاضی سے مدد دینے پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ چنانچہ ۱۹۱۴ء میں نواب صاحب نے نواب محمد اسحاق خاں آنریری سیکریٹری مدرسۃ العلوم مسلمانان علی گڑھ کو خط لکھ کر امیر خسرو کی تصانیف کی نشر و اشاعت کی طرف توجہ دلائی جس کے بعض اقتباسات درج ذیل ہیں۔

" نہایت وثوق کے ساتھ بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی ہندستان میں کوئی مصنف ایسا نہیں گزرا جسکی تصانیف اس درجہ لائق حفاظت و اشاعت ہوں جیسا کہ امیر خسرو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اگر آپ کی کوشش سے اس مشہور زمانہ عدیم النظیر مصنف کا پورا کلام نظم و نثر جمع ہو کر چھپ گیا تو یہ قوم کی ایک بڑی عظیم الشان خدمت ہوگی جس کا نفع غیر محدود ہوگا اور جو سعی کرنے والوں کے نام کو بھی زندہ جاوید بنا دے گی۔

میں دولت مند نہیں ہوں۔ اگر میرے پاس دولت ہوتی تو میں اس کام کیلئے اس کو وقف کر دیتا۔ بایں ہمہ جہاں تک مجھ سے ہو سکے گا میں اس کام میں مالی مدد دوں گا اور اپنے احباب سے بھی کچھ رقم وصول کر کے بھیجوں گا۔ کام شروع کرنے کے لئے خود ایک ہزار روپے اس وقت دیتا ہوں اور بوقت ضرورت ایک ہزار اور دوں گا "

اس کے بعد نواب اسحاق خاں بالکل آمادہ ہو گئے۔ نواب عماد الملک نے دو ہزار دیئے سرکار عالی سے ساڑھے سات ہزار، نواب سالار جنگ سے ایک ہزار مولوی انوار اللہ خاں صاحب (فضیلت جنگ) سے پانسو کل ساڑھے دس ہزار جمع کر کے بھیجے۔

اسی طرح وہ اہل علم کی بھی مدد کرتے تھے اور جب کبھی ان کے علم میں آجاتا کہ فلاں عالم کوئی مفید علمی کام کر رہا ہے تو سفارش کر کے حکومت سے امداد دلوانے میں دریغ نہ کرتے۔

مولانا محمود الحسن ٹونکی مرحوم ایک عالم متبحر تھے۔ علوم اسلامیہ پر انکی نظر بہت وسیع اور گہری تھی بہت روشن خیال اور نہایت زندہ دل اور خوش مذاق بزرگ تھے۔ وہ مصنفین اسلام پر ایک کتاب کیا ان سائی کلو پیڈیا لکھ رہے تھے۔ ایک جلد مصر میں طبع ہوئی تھی اور وہاں کے علما نے اسے بہت پسند کیا تھا۔ دوسری جلد کی نوبت ابھی نہ آئی تھی کہ جنگ عظیم کی آفت نازل ہوئی اور وہ مسودہ تلف ہو گیا۔ میں نے عماد الملک بہادر سے اسکا تذکرہ کیا تو انھوں نے فوراً اعلاحضرت حضور نظام کو لکھ کر منظوری حاصل کی اور مولانا کو حیدرآباد طلب فرما کر اس کام پر مامور کر دیا۔ اور ایک معقول تنخواہ ان کیلئے مقرر

ہوگئی اور ایک مختصر ساعملہ بھی دیدیا گیا۔ یہ بہت وسیع اور عظیم الشان کام تھا۔ مولانا دن رات اس میں مصروف رہتے تھے۔ چند حصے دائرۃ المعارف میں طبع بھی ہوئے۔ باقی مجلدات عثمانیہ یونیورسٹی کے ادبی انبارخانے میں پڑی سڑرہی ہیں جن کا اب کوئی قدردان نہیں۔ اس تصنیف کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ جب اس کے بعض حصے ڈاکٹر کرینکو کی نظر سے گزرے جو عربی علوم کے محقق فاضل تھے تو انھیں یقین نہ آتا تھا کہ یہ اتنا بڑا اور ایسا مشکل کام ایک فرد واحد کا کیا ہوا ہو۔

اسی طرح جب مولوی عبدالجبار خاں ملکاپوری نے دکن کی مبسوط تاریخ لکھنی شروع کی تو نواب صاحب نے سفارش کرکے دولت آصفیہ سے چھے ہزار روپے منظور کرائے۔

مولوی عبداللہ خاں نے بعض بہت مفید علمی کتابیں چھپوا کر شائع کیں۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور کتب خانہ آصفیہ ہی میں رہتے تھے۔ نواب صاحب نے ان کی سرپرستی فرمائی اور سروآزاد اور مآثرالکلام جیسی کتابوں کی اشاعت پر اپنی جیب سے مختلف اوقات میں کئی ہزار روپیہ عنایت فرمائے اور اعلاحضرت سے سفارش کرکے تاحیات پچاس روپے وظیفہ مقرر کرادیا۔

ایسے ہی ایک دو صاحبوں کا جو علمی یا مذہبی کام کررہے تھے میں نے ان سے تذکرہ کیا۔ اور انھوں نے اعلاحضرت سے سفارش کرکے منصب (یعنی دوامی وظیفہ) مقرر کرادیا۔

طالب علموں کی اکثر مدد کرتے رہتے تھے اگر کسی تعلیم کے شوقین نادار طالبعلم کی سفارش کی جاتی تو تعلیمی وظیفہ مقرر کردیتے۔ ایک روز مجھ سے فرمانے لگے کہ دلی سے ایک نوجوان عبدالرؤف کا خط آیا ہے جو ابھی ابھی انگلستان سے بیرسٹری کی ڈگری لے کر آئے ہیں لیکن بوجہ کم استطاعتی اپنا کام شروع نہیں کرسکتے۔ انھوں نے مجھ سے مالی مدد طلب کی ہے میں نے کہا یہ نوجوان میرن صاحب کے نواسے ہیں۔ ان کو اسکا علم نہ تھا۔ لیکن وہ اس نوجوان کے حسن تحریر سے اس قدر متاثر ہوئے کہ فوراً لکھ بھیجا

کہ تم کو کس قدر رقم کی ضرورت ہے اطلاع دو کہ اس کا انتظام کر دیا جائے۔ وہ بھی ایسے خود دار اور شریف النفس تھے کہ جواب میں لکھا کہ یہاں حسب دل خواہ انتظام ہو گیا ہے، آپ زحمت نہ فرمائیں۔ ایک روز مجھ سے پوچھنے لگے کہ ایسا معلوم ہوا ہے کہ جامعۂ عثمانیہ کے طلبہ کی ٹیم کھیلوں کے دورے پر جا رہی ہے میں نے کہا ہاں فلاں فلاں مقام پر جائیں گے۔ یہ سننے کے بعد کئی سو روپے ان کے سفر خرچ کے لئے بھیج دیئے۔

نواب صاحب کا ادبی ذوق اعلادرجے کا تھا۔ فارسی اور عربی کے جید عالم تھے فرنچ خوب جانتے تھے اور انگریزی زبان پر حیرت انگیز قدرت تھی۔ وہ ایرانیوں سے فارسی میں اور عربوں سے عربی میں بلا تکلف گفتگو کرتے تھے جب امیر امان اللہ خاں ہندستان آئے اور ان کے پروگرام میں علی گڑھ کالج کا معائنہ بھی تھا تو نواب محسن الملک نے امیر صاحب کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے فارسی سپاس نامہ نواب عماد الملک بہادر ہی سے لکھوایا تھا۔ عربی ادب کے ذوق کے متعلق شرر صاحب کی رائے لکھ چکا ہوں کہ وہ جاہلیت کے شعرا کے سادہ اور پرجوش کلام کے بہت مداح تھے اور مولدین کا کلام پسند نہیں کرتے تھے۔ فارسی میں وہ شیخ سعدی کے بہت قایل تھے اور شیخ کی عاشقانہ شاعری کو حافظ کی شاعری پر ترجیح دیتے تھے۔ اُردو میں لکھنو کی شاعری بہت ناپسند تھی۔ انھیں لفظی صنائع سے جس پر لکھنوی شاعری کا دارومدار تھا اور عامیانہ خیالات سے بہت چڑ تھی۔ وہ کہتے تھے کہ ہماری زبانوں (اردو فارسی عربی) میں نثر تھی ہی نہیں وہ ایک قسم کی شاعری یا نیم شاعری تھی۔ حالی نے اردو کو متین نثر عطا کی جو علمی اور ادبی مضامین ادا کرنے کی قوت رکھتی ہے۔ میر انیس کی شاعری کے بہت مداح تھے اور ان کے کلام کے بعض اشعار جنھیں وہ ان کا شہ کار سمجھتے تھے زبانی یاد تھے اور کبھی کبھی سناتے تھے لیکن کہتے تھے میر صاحب بھی بعض اوقات لفظی رعایت اور صنائع بدائع سے دامن نہ بچا سکے چنانچہ فرماتے تھے کہ میں نے میر صاحب سے پوچھا کہ آپ لفظی رعایتوں اور صنائع بدائع کو پسند کرتے ہیں

تو انھوں نے جواب دیا "نہیں" لیکن آخر لکھنؤ میں رہنا ہے۔ انگریزی زبان میں متعدد مقالے اور مضامین اور نظمیں جو انھوں نے مختلف اوقات میں لکھیں کتاب کی صورت میں شائع ہو گئی ہیں۔ اس مجموعہ میں ان کا وہ فاضلانہ مقالہ بھی ہے جو انھوں نے "اصطلاحات علمیہ" پر تحریر فرمایا تھا۔ یہ آج سے تقریباً چوراسی پچاسی برس پہلے لکھا گیا تھا مگر اب بھی پڑھنے کے قابل ہے اور اس میں جو نکات اصطلاحات کے وضع یا ترجمہ کرنے یا اپنے قدیم الفاظ کو کام میں لانے کے متعلق بیان کئے ہیں اور انگریزی اصطلاحات کو بجنسہ اختیار کرنے کے خلاف جو بحث کی ہے اور اس مسئلے کے متعلق بعض مختلف آرا پر جو تنقید فرمائی ہے اس کا مطالعہ اب بھی ہمارے لئے مفید ہو سکتا ہے۔ نواب صاحب کی انگریزی انشا پردازی کے نہ صرف ہمارے ملک کے تعلیم یافتہ بلکہ اہل زبان بھی معترف تھے۔ ۱۹۰۶ء میں مسلمانوں کا ایک وفد آغا خاں کی سرکردگی میں لارڈ منٹو کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ یہ مسلمانوں کا بہت اہم اور تاریخی وفد تھا جس میں ملک کے متعدد صاحب الرائے اور نام و نمود کے مسلمان شریک تھے۔ یہ وقت مسلمانوں کے لئے بہت نازک تھا۔ تنسیخ تقسیم بنگال کے بعد سے مسلمانوں میں عام طور پر مایوسی اور افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ وفد کی تجویز نواب محسن الملک کے فکر رسا کا نتیجہ تھی جو اپنے وقت کے نہایت دوربین اور روشن خیال سیاست داں تھے انہی نے آغا خاں کو گھیرا اور نواب عماد الملک کو بلا کر وہ اڈریس لکھوایا جو وائسرائے کی خدمت میں پیش کیا جانے والا تھا۔

سیاست میں وہ سر سیّد احمد خاں کے پیرو تھے۔ جب سر سیّد نے انڈین نیشنل کانگریس کی بعض وجوہ کی بنا پر مخالفت کی تو اس کی تائید میں ایک بہت پرزور تحریر انگریزی زبان میں لکھ کر شائع کی۔ وہ انگریزی حکومت کو ملک کے حق میں باعث خیر و برکت سمجھتے تھے۔ پرانے لوگ اکثر اسی خیال کے تھے۔ انھوں نے اپنے زمانے کی طوائف الملوکی اور دیسی حکومتوں کی بدنظمی، ابتری، ناانصافی، رشوت خواری ظلم و جبر دیکھے تھے۔ انگریزوں

نے ریلیں جاری کیں، تار گھر، ڈاک خانے بنائے، عدالتیں قائم کیں، لوٹ مار اور ظلم و جبر کا انسداد کیا، تعلیم پھیلائی اور مدرسے اور کالج اور یونی ورسٹیاں قائم کیں، سفر کی آسانیاں پیدا ہوگئیں۔ انصاف ہونے لگا۔ امن و امان قائم ہوگیا۔ یہ سب کچھ دیکھ کر وہ انگریزوں سے بہت خوش تھے اور ان کی عقل و دانش اور انتظام و انصاف کی بہت تعریف کرتے تھے۔ ان بزرگوں کو ملک کے اقتصادی اور سیاسی حالات سے کچھ بحث نہ تھی اور نہ وہ ان مسائل کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ یہ تو گیا ہندستان کے جلیل القدر رہنما، نئی قومیت کے روح و رواں اور روحانی پیشوا تک اسی خیال کے تھے۔ راجہ موہن رائے جو سنسکرت، عربی، فارسی اور انگریزی زبان کے بڑے عالم تھے، اعتراف کرتے ہیں کہ پہلے وہ جوانی کی اندھی حب الوطنی میں انگریزوں سے سخت نفرت کرتے تھے لیکن بعد میں مجھے اُن بے بہا فوائد کا علم ہوا جو انگریزوں کی حکومت سے ہمیں حاصل ہوئے ہیں اور میں ان کو ہندوستان کے حق میں رحمت سمجھتا ہوں۔ بنکم چندر چڑجی نئی ہندو قومیت کا بانی اور مشہور ناول "انند مٹھ" کا مصنف جو سخت متعصب اور مسلمانوں کا بدترین دشمن ہے، اس ناول میں کٹر سنیاسی کے جواب میں گرو کی زبان سے یہ کہلاتا ہے "دشمن کون ہے؟ انگریز دوست ہیں"۔ اسی طرح ہندوؤں کے فاضل روحانی پیشوا اور مبلغ سوامی ویکانند انگریزوں کی تعریف میں رطب اللساں ہیں۔ اور اکثر مواقع پر انھوں نے انگریزوں کی حکومت کی برکات کا ذکر کیا ہے۔ جسٹس راناڈے نے اپنے ایک خطبے میں انگریزوں کی آمد کو مشیت ایزدی اور ملک کے حق میں باعث خیر فرمایا تھا۔ ابتدا میں گوکھلے اور گاندھی یہی کہتے تھے۔ شروع شروع میں انڈین کانگرس کا بھی یہی خیال تھا۔ اُس وقت کانگرس والے صرف اتنا چاہتے تھے کہ انھیں حکومت میں ذمہ داری کے عہدے ملیں اور حکومت کے نظم و نسق میں ان کا بھی دخل رہے۔ حالات کے مطالعہ اور اقتصادی اور سیاسی امور میں غور کرنے اور علمی تحریکوں میں پڑنے سے

ان کا نقطۂ نظر بدل گیا۔ ہمارے بزرگ جو زمیندار قسم کے تھے اپنے پرانے خیال سے نہ ہٹے۔
ان میں بہت کم ایسے تھے جنھوں نے ملکی معاملات کو غور سے دیکھا ہو اور ان میں بصیرت حاصل
کی ہو۔ مولوی قسم کے لوگ جو انگریزوں سے نفرت کرتے تھے اور ان کو مسلمانوں کا بدخواہ سمجھتے
تھے ان کی نفرت کچھ تو مذہبی تعصب پر مبنی تھی اور کچھ اس وجہ سے کہ مسلمانوں کی حکومت
اور وقار کو ان سے نقصان پہنچا تھا۔ یہ بات بہت دیر میں سمجھ میں آئی کہ انگریز حکومت سے
اصل نقصانات کیا پہنچے۔ اور بعض آخر تک نہ سمجھے۔ اس بارے میں نواب عماد الملک کا
ذاتی خیال اس ایک جملے سے ظاہر ہوگا کہ جس زمانے میں وہ انڈین لیجس لیٹو کونسل کے ممبر
تھے انھوں نے اپنی ایک تقریر میں کہا کہ ہمیں حکومت میں جنٹلمین کی ضرورت
ہے۔ یہ وہی پرانا خیال ہے جس کا اظہار ہمارے بزرگ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ مقابلے کے امتحان
میں ایرے غیرے کامیاب ہو کر آجاتے ہیں اور ہم پر حاکم بنا دیئے جاتے ہیں جو شریفانہ اطوار و
آداب سے عاری ہوتے ہیں۔ نواب عماد الملک کو خاندانی شرافت کا بڑا خیال تھا اور اسے بہت
اہمیت دیتے تھے۔ قصباتی شرفا اس معاملے میں بہت سخت ہوتے ہیں۔ گو انھیں بلگرام میں
رہنے کا زیادہ اتفاق نہیں ہوا تھا تاہم قصباتی شرفا کی خو بو ان میں موجود تھی۔ ایک دن اتفاق
سے میں ان کے ہاں گیا تو دیکھا ایک صاحب سے باتیں کر رہے ہیں جب وہ رخصت ہو کر چلے گئے تو کہنے
لگے یہ شخص شریف نہیں معلوم ہوتا۔ میں نے کہا بظاہر تو ایسا نہیں معلوم ہوتا۔ آدمی تعلیم یافتہ ہیں
کہنے لگے بعض الفاظ کا تلفظ غلط کر رہا تھا۔ مجھے یہ سنکر کسی قدر تعجب ہوا اور سوچنے لگا کہ شرافت
کی پرکھ بھی عجیب ہے۔ ایک مولانا حالی تھے جو کہہ گئے ہیں۔

"کچھ اور آؤ بن کر تم اے میرو مرزا نہیں پوچھتے یہاں حسب و نسب کچھ"

میں نے مولانا سے پوچھا "کچھ اور آؤ بن کر" سے کیا مراد ہے۔ فرمایا "مزدور"۔ دونوں شراف
ہیں اور قصباتی ہیں۔ ایک نہ صرف وقت کے تقاضے کو بلکہ انسانیت کے تقاضے کو بھی
سمجھتا تھا اور دوسرا قدیم رسم و راہ اور وضع کا پابند تھا، جہاں تھا وہیں رہا۔

امیرانہ شان سے رہتے تھے لیکن اس میں تصنع نہ تھا۔ عالی شان کوٹھی تھی اور اسی مناسبت سے اسکا فرنیچر اور سامان تھا۔ مزاج میں بہت نفاست تھی۔ صفائی کا بہت خیال رکھتے تھے۔ ریاست میں انکا کوئی بہت بڑا عہدہ نہ تھا لیکن زمانہ ملازمت میں اور خدمت سے سبکدوش ہونے کے بعد بھی انکی خودداری اور وقار ایسا تھا کہ تمام عہدہ دار اور امرا وزراان کا بہت ادب و احترام کرتے تھے اور اس طرح ملتے تھے جیسے کوئی خورد کسی بزرگ سے ملتا ہو۔

ان کی امیرانہ شان و معاشرت اور ظاہری رکھ رکھاؤ اور رعب داب کو دیکھ کر لوگ انکے پاس جاتے ہوئے گھبراتے تھے لیکن وہ بہت صاف باطن بامروت اور منکسر مزاج تھے۔ خاص کر اہل علم سے مل کر بہت خوش ہوتے تھے اور بے تکلف علمی باتیں کرتے تھے۔ ایسے وقت میں کوئی بڑا شخص آجاتا تو ملنے سے صاف انکار کر دیتے ایک بار کا ذکر ہے کہ ان کے فرزند نواب عقیل جنگ ان سے ملنے آئے۔ اس وقت نواب صاحب کے پاس مولوی ہاشم ندوی بیٹھے ہوئے تھے جو نواب صاحب کے کتب خانے کی ترتیب وغیرہ کا کام کرتے تھے۔ نواب عقیل جنگ نشست کے کمرے میں آتے تو مولوی صاحب سے مخاطب ہو کر کہنے لگے کہ نیچے آپ کا جھٹکا کھڑا ہے (جھٹکا دکن میں ایک ادنا قسم کی سواری ہوا) یہ سنتے ہی نواب صاحب سخت برہم ہوئے اور کہنے لگے "تم اہل علم کی توہین کرتے ہو۔ تم بھول گئے تمہارا باپ ایک زمانے میں جوتیاں چٹخاتا پھرتا تھا" غرض اس بری طرح ڈانٹا کہ وہ پانی پانی ہو گئے۔ عقیل جنگ کا منشا طعن کرنا نہ تھا۔ بات یہ ہے کہ مولوی صاحب کا جھٹکا پورٹی کو (پیش) میں سیڑھیوں کے عین سامنے کھڑا تھا جس سے آنے جانے والوں اور دوسری سواریوں کو زحمت ہوتی تھی۔ غرض یہ کہ اس معاملہ میں نواب عماد الملک بہت سخت تھے۔ وہ علم کی قدر کرتے تھے خواہ صاحب علم کیسا ہی خستہ حال اور پھٹے پرانے کپڑوں میں ہو۔ وہ خود بھی طالب علم تھے اور باوجود اس مرتبہ پہ پہنچنے کے ان کے مزاج میں طالب علمانہ سادگی موجود تھی۔ اور ادبی علمی گفتگو

میں ان کا انداز تخاطب بالکل ایسا ہی ہوتا تھا جیسے ایک طالب علم کا دوسرا طالب علم سے ہوتا ہے۔ اس وقت وہ فرق مراتب کا بالکل خیال نہیں کرتے تھے۔

اردو زبان و ادب سے انھیں خاص لگاؤ تھا چنانچہ حیدرآباد آنے کے دوسرے ہی سال ۱۸۷۴ء میں ایک ماہانہ اردو رسالہ "مخزن الفوائد" جاری کیا۔ یہ رسالہ دو سال تک جاری رہا۔ اس میں ان کے متعدد مضامین شائع ہوئے۔ ان میں بیشتر سائنسی موضوع پر تھے۔ ہمارے تعلیم یافتہ حضرات کے شعار میں اب تک یہ بات داخل ہے کہ آپس میں انگریزی میں بات چیت کرتے ہیں اور انگریزی میں خط و کتابت کرتے ہیں۔ نواب عماد الملک ہمیشہ اردو میں گفتگو کرتے تھے۔ ایسے لوگوں سے جن کی زبان اردو ہے یا جو اردو جانتے ہیں انگریزی میں بات چیت کرنے کو بدتمیزی اور چھوٹا تفاخر خیال کرتے تھے۔ البتہ جب کسی ایسے شخص سے ملاقات ہوتی جو اردو نہیں جانتا مثلاً ایرانی عرب یا انگریز تو اس سے اس کی زبان میں باتیں کرتے تھے۔ ایک بار ایک صاحب جو پہلے برٹش انڈیا میں ایک اعلا عہدے پر تھے اور بعد میں بھوپال میں وزیر ہو گئے تھے نواب صاحب سے ملنے آئے اور آتے ہی انگریزی میں گفتگو کرنی شروع کی۔ نواب صاحب نے فرمایا میری زبان انگریزی نہیں اور نہ غالباً آپ کی ہے۔ کوئی انگریز آجاتا ہے تو میں اس سے سٹر پٹر انگریزی میں بات چیت کر لیتا ہوں ورنہ میں انگریزی زبان میں بات چیت کرنا ناپسند کرتا ہوں۔ وہ صاحب بہت شرمندہ ہوئے اور معذرت کرنی پڑی۔

وہ ہندستان کے نظام تعلیم کو اس وجہ سے بھی ناپسند کرتے تھے کہ اس میں ذریعہ تعلیم انگریزی ہے۔ ان کی رائے میں یہ طریقہ نہ صرف حصول علم میں مانع ہے بلکہ اس کا اخلاق پر بھی برا اثر پڑتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جامعہ عثمانیہ کے طرز تعلیم کے حامی تھے کہ اس میں ذریعۂ تعلیم اردو ہے چنانچہ ان خیالات کا اظہار انھوں نے اپنے خطبۂ صدارت

حیدرآباد ایجوکیشن کانفرنس منعقدہ حیدرآباد دکن ۱۹۱۷ء میں کیا ہے جس کا مختصر اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔

"ثانوی مدارس میں ابتدا سے انگریزی شروع کرائی جاتی ہے جو ہمارے لئے ایک اجنبی اور نہایت ادق زبان ہے اور لڑکے مجبور کئے جاتے ہیں کہ تمام ابتدائی فنون مثل حساب جغرافیہ تاریخ وغیرہ کو اسی غیر مانوس زبان کے ذریعہ سیکھیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اپنی زبان سے کم و بیش ناواقف رہ جاتے ہیں اور انگریزی بھی اچھی طرح نہیں آتی۔ بیشتر تعداد طلبہ کو دس دس بارہ بارہ سال اسکول ہی کی حدود کے اندر صرف کرنے پڑتے ہیں۔ اس عرصۂ دراز میں ان کو کیا حاصل ہوتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ انگریزی قدرے قلیل سیکھ لیتے ہیں۔ انگریزی میں حساب کے معمولی سوالات کا جواب دے سکتے ہیں۔۔ جغرافیہ جانتے ہیں۔ اقطار دنیا کے نام جانتے ہیں۔ خاص خاص ملکوں کے مشہور و معروف شہروں ندیوں پہاڑوں کے انگریزی نام بتا سکتے ہیں اور نقشے میں ان کا نشان دیکھ سکتے ہیں۔ یورپ خصوصاً انگلستان کی تاریخ کسی قدر جانتے ہیں ہندوستان کی تاریخ سے بھی ایک حد تک واقف ہیں اور آپ کو بتا سکتے ہیں کہ جہانگیر ایک شرابی سلطنت سے بے خبر اور اورنگ زیب ایک سخت متعصب اور ظالم بادشاہ تھا۔ اپنی زبان سے بالکل لاعلم نہیں کٹر مٹر بول لیتے ہیں مگر اپنی مذہبی زبان اور بزرگوں کے علوم اور حالات سے بالکل نابلد ہیں۔ کالج میں چار پانچ سال تعلیم پانے کے بعد ان کی حالت میں زیادہ تغیر نہیں ہوتا بجز اسکے کہ ہمہ تن مغربی دنیا کے مقلد بن جاتے ہیں سراسر ہمیں مغربی پیروی کرنا چاہتے ہیں۔ اپنے قومی اخلاق پاکیزہ تہذیب چھوڑ کر مغربی اخلاق اختیار کرتے ہیں۔ آپس میں گفت و شنید بات چیت سلام علیک سب انگریزی زبان میں کرنا انکو بھاتا ہے کھانا پینا انگریزی قسم کا پسند کرتے ہیں۔ اپنے آٹھ کروڑ ہم مذہبان ہند کو مسلم ڈیمالیسی کے نام سے شرف بخشتے ہیں اپنی زبان میں تحریر و تقریر کرتے ہیں تو اس میں حتی الوسع انگریزی لغات کی بھرمار کر دیتے ہیں۔"

بہتوں کو نماز نہیں آتی، سورے یاد نہیں۔ ایک صاحب کو میں نے سنا ہے کلمہ توحید تک معلوم نہ تھا کہ کیا شے ہے۔ اور کس کا نام ہے۔"

کالجوں میں انگریزی ذریعۂ تعلیم کے متعلق فرماتے ہیں اگر یہی طریقہ قائم رہا تو ہماری آبائی زبان یعنی اردو ایک جاہلانہ زبان رہ جائے گی اور عام طور پر ہمارے ہم قوم و ہم وطن علوم مغربیہ سے ہمیشہ ناآشنا رہیں گے ۔ ۔ ۔ ۔ اگر اس مبارک عثمانیہ یونی ورسٹی یعنی جامعۂ عثمانیہ کو جس میں خاص اردو زبان واسطہ تعلیم علوم و فنون قرار دی گئی ہے حسب امید کامیابی ہوئی تو یہ عیب مٹ جائے گا اور ہماری زبان قلیل عرصے میں دولت علمیہ سے مالا مال ہو جائے گی۔"

جب سنہ ۱۹۱۲ء میں انجمن ترقی اردو کا کام مجھے تفویض ہوا تو میں نے صدارت کے لئے نواب صاحب کا نام پیش کیا۔ انجمن کی مجلس انتظامی نے بالاتفاق منظور کیا اور حقیقت یہ ہے کہ ہر اعتبار سے کوئی دوسرا شخص ان سے بہتر ہمیں انجمن کی صدارت کے لئے نہیں مل سکتا تھا۔ انجمن کو ان سے علاوہ ادبی علمی مشورے کے ہر قسم کی مدد ملی۔ مثلاً میں نے ایک دن عرض کیا کہ اگر آپ ہز ہائی نس آغا خان سے انجمن کی امداد کی تحریک فرمائیں تو امید ہے کہ معقول عطیہ مل جائے۔ کیونکہ وہ قومی اور علمی کاموں کی امداد میں بہت فیاض ہیں۔ انھوں نے فوراً کاغذ قلم لے فارسی زبان میں خط لکھ مارا۔ مگر آغا خان نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس زمانے میں آغا خان یورپ میں تھے۔ اس کے کچھ دنوں بعد ہی سید راس مسعود نے انگلستان کا قصد کیا تو میں نے ان سے کہا آغا خان بھی آج کل وہیں تشریف رکھتے ہیں ذرا انکو کھٹ کھٹائیے گا حضرت نے نواب عماد الملک کے خط کا جواب تک نہیں دیا۔ سید صاحب سفر سے واپس آئے تو کہا آغا خان سے ملا تھا انھوں نے فرمایا کہ فلاں تاریخ کو بمبئی پہنچنے والا ہوں وہاں ملئے۔ چنانچہ اس تاریخ کو میں اور سید صاحب بمبئی پہنچے۔ معلوم ہوا کہ وہ پونا تشریف

لے گئے ہیں اور یہ کہہ گئے ہیں کہ پوتے اگر ملئے۔ میں نے سید صاحب سے کہا بس آپ تشریف لے جائیے مجھے معاف رکھئے۔ وہ گئے۔ ہزآئی نس آغا خاں تپاک سے ملے۔ انجمن کا معروضہ سماعت فرمایا۔ اپنے کارندۂ خاص کو بلایا۔ حکم دیا کہ انجمن کو ایک ہزار ماہانہ کے حساب سے دس ہزار کا عطیہ ہماری طرف سے دیا جائے۔ اس نے فوراً یہ حکم اپنی دستکی میں ٹانک لیا۔ اس کے بعد کئی بار یاد دہانی کی گئی جواب ندارد۔ بڑے آدمیوں کے وعدے ایسے ہی ہوتے۔ جو جتنا بڑا ہوتا ہے اس کے وعدے کے ایفا کو بھی اتنی ہی دیر لگتی ہے۔ میرے پاس ایسے بہت سے شاندار وعدے موجود ہیں۔ اس دنیا میں تو ان کی کچھ پوچھ گچھ نہ ہوگی۔ ایک روز داور محشر کے آگے پیش کرنے پڑیں گے۔

اسی طرح جب میں حیدرآباد سے وطن (شمالی ہند) جانے لگا تو نواب صاحب سے عرض کی کہ اگر مناسب ہو تو انجمن کی امداد کے سلسلے میں ایک خط نواب صاحب رامپور (نواب حامد علی خاں) کے نام عنایت فرمایا جائے۔ آپ نے ایک خط فرماں روائے ریاست رامپور کے نام لکھ کر دیا جس میں انجمن کے کارناموں کا مفصل ذکر تھا۔ میں نے یہ خط لے جا کر نواب صاحب کی خدمت میں پیش کیا چند سطریں پڑھ کر اپنے معتمد خاص کے حوالہ کر دیا۔ میں نے چاہا کہ انجمن کے متعلق کچھ عرض کروں لیکن انھوں نے نواب عماد الملک کی توصیف و ثنا شروع کر دی۔ وہ ان کا نام بڑے ادب سے لیتے تھے اور ان کی باتوں سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ ان کو نواب عماد الملک سے خلوص ہے۔ وہ ملتجیانہ لہجے میں مجھ سے بار بار کہتے رہے کہ کسی طرح آپ انھیں یہاں لائیے مجھے بے حد مسرت ہوگی میری بڑی تمنا ہے کہ وہ کچھ دن میرے پاس آ کر رہیں۔ میں نے کہا ان کی ٹانگ کو جب سے صدمہ پہنچا ہے انھیں اٹھنے بیٹھنے میں بہت تکلیف ہوتی ہے۔ جب کسی سے ملاقات کرنی ہوتی ہے تو اپنے خاص کمرے سے پہیے دار کرسی میں باہر آتے ہیں۔ ایسی حالت میں ان کا یہاں آنا محال ہے۔ کہنے لگے آپ کسی طرح انھیں بمبئی تک

سے لے آیئے پھر میں بمبئی پہنچ کر نہایت آسائش و آرام کے ساتھ یہاں لے آؤں گا۔ غرض میں وہاں تین چار روز رہا۔ بہت خوشی سے ملتے بلکہ بعض اوقات دور ہی سے دیکھ کر بڑے تپاک سے آیئے آیئے مولوی صاحب آیئے کہتے اور دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہتے لیکن انجمن کا معاملہ کبھی بیچ میں نہ آنے دیتے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو غیر ضروری اور بیجا کاموں میں روزانہ ہزاروں روپے صرف کر دیتے ہیں۔

اورنگ آباد سے مجھے اکثر سرکاری کاموں یا محکمۂ تعلیم یا یونی ورسٹی کی کمیٹیوں میں شرکت کے لئے حیدرآباد آنا پڑتا تھا۔ قیام حیدرآباد کے ان ایام میں نواب صاحب سے ملتا رہتا تھا۔ ایک روز جو میں گیا تو چلتے وقت مجھ سے پوچھنے لگے۔ کیا امپیریل بنک آپ کے قیام گاہ کے قریب ہے۔ میں نے کہا جی ہاں قریب ہی ہے فرمایا یہ خط بنک میں بھجوا دیجئے گا۔ آخر زمانے میں وہ چلتے وقت کسی ایسے ملنے والے سے جو قابل اعتماد ہو اور جس سے تکلف نہ ہو رخصت کے وقت یہ پوچھ لیتے تھے کیا ڈاک خانہ آپ سے قریب ہے اور جو وہ کہتا کہ قریب ہے تو وہ اپنے خط دے دیتے تھے کہ یہ ڈاک میں ڈلوا دیجیے گا۔ میں نے مکان پر آکر خط بنک میں بھجوا دیا۔ دوسرے دن بنک نے مجھے اطلاع دی کہ نواب عماد الملک نے دو ہزار کا چیک انجمن کے نام بھیجا تھا جو انجمن کے حساب میں درج کر دیا گیا ہے۔ دوسرے دن جو میں ملنے گیا تو میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ فرمایا کہ اس کا اعلان نہ کرنا اور نہ کسی اخبار یا رپورٹ میں لکھنا۔ میں نے عرض کیا کہ یہ رقم انجمن کے حساب میں درج ہوگی تو سالانہ رپورٹ میں بھی ذکر آتے گا۔ اور جیسے اور عطیات کا اعلان کیا جاتا ہے اس کا بھی کیا جائے گا۔ آپ جو منع فرماتے ہیں اس میں کیا مصلحت ہے۔ کنگ کوٹھی کی طرف اشارہ کر کے فرمایا "وہ کہے گا مجھے کیوں نہیں دیا"۔ اس کی تشریح کی ضرورت نہیں جو لوگ حضور نظام میر عثمان علی خاں کی عادات و خصائل سے واقف ہیں وہ سمجھ گئے ہوں گے۔

رسالہ اردو کو بالالتزام پڑھتے تھے بعض اوقات مضامین کے متعلق رائے یا مشورہ دیتے اور کبھی کبھی الفاظ کی صحت و غلطی کے متعلق رائے لکھ بھیجتے۔

جب نواب یوسف علی خاں سالار جنگ ثالث عہدہ مدار المہامی پر سرفراز ہوئے تو اس خیال سے کہ یہ نوجوان ہیں اور نظم و نسق ریاست کا تجربہ نہیں رکھتے نواب عماد الملک ان کے مشیر مقرر ہوتے۔ اس زمانے میں آپ نے ایک گشتی مراسلہ جاری فرمایا جس میں ممالک محروسہ سرکار عالی کے تمام دفاتر کو ہدایت کی کہ اردو مراسلوں میں بلاوجہ انگریزی الفاظ استعمال نہ کیے جائیں۔

انھیں جھوٹ سے سخت نفرت تھی اور جھوٹے کو کبھی منہ نہیں لگاتے تھے۔ ہمارے شرفا مروت میں آکر یا تالیف قلوب کی خاطر یا اس خیال سے کہ دل شکنی نہ ہو سچ کو چھپاتے یا جھوٹ کے مرتکب ہوتے ہیں۔ یا ایسے کام کی ہامی بھر لیتے ہیں جو وہ نہیں کر سکتے یا اس کا کرنا ان کے ضمیر کے خلاف ہے۔ اس کا نتیجہ کذب یا پشیمانی ہوتا ہے۔ نواب عماد الملک کا مسلک بالکل صاف تھا۔ جب وہ کسی کام کو نہیں کر سکتے تھے یا نہیں کرنا چاہتے تھے یا اسے اپنے اصول اور وضعداری کے خلاف سمجھتے تھے تو صاف انکار کر دیتے تھے۔ انھوں نے حیدرآباد آنے کے بعد جو مخزن الفوائد رسالہ نکالا تھا اس میں ان کا ایک مضمون "راستی و راست بازی" شائع ہوا تھا۔ اسے پڑھکر ان کی سیرت سامنے آجاتی ہے۔ وہ راست گفتاری اور صاف گوئی میں نیک نام نہیں بدنام تھے۔ ایک بار کا ذکر ہے کہ اعلاحضرت میر محبوب علی خاں نے بہ سبیل تذکرہ اپنے مصاحبوں اور اعلا ارکان ریاست سے جو اس وقت حاضر تھے پوچھا کہ لوگوں کا میری نسبت کیا خیال ہے۔ ان مصاحبوں نے عرض کیا کہ رعایا حضور کی فیاضی، حملی قدردانی، سیاست و تدبر، کاردانی اور عالی دماغی کے بے حد مداح ہے۔ غرض ہر ایک نے تعریف کے پل باندھ دیے۔ نواب عماد الملک خاموش بیٹھے رہے آخر اعلاحضرت نے

پھر خود ہی فرمایا مولوی صاحب آپ نے کچھ نہیں کہا۔ نواب صاحب نے کہا لوگ کہتے ہیں کہ
"آپ شراب پیے پڑے رہتے ہیں۔ کام کی طرف بالکل توجہ نہیں کرتے۔ سرکاری کاروائیاں
کئی کئی مہینے پڑی رہتی ہیں۔ ریاست کا انتظام خراب ہو رہا ہے" یہ سننا تھا کہ
دربار میں سناٹا چھا گیا۔ اعلاحضرت فوراً اٹھ کر اندر چلے گئے۔ جن لوگوں نے
ہمارے سابق بادشاہوں کے حالات پڑھے ہیں انھیں معلوم ہے کہ ان کے حضور
میں خفیف سے اختلاف میں بھی جان کی خیر نظر نہیں آتی تھی۔ یہی حال دولت
آصفیہ کے فرمانرواؤں اور ان کے پیش رو بادشاہوں کے درباروں کا تھا۔
ایسی جسارت تو کجا خفیف سے خفیف اختلاف کی بھی مجال نہ تھی۔ اہل دربار مولوی
صاحب کی یہ صاف بیانی سن کر دنگ رہ گئے اور ڈر رہے تھے کہ دیکھئے اعلاحضرت
قدر قدرت کا کیا عتاب نازل ہوتا ہے۔ دوسرے روز اعلاحضرت نے نواب
عماد الملک کو یاد فرمایا۔ جب حاضر ہوئے تو فرمایا "آپ کو سب کے سامنے ایسا نہیں کہنا
چاہئیے تھا" نواب صاحب نے عرض کیا کہ حضور نے سب کے سامنے دریافت فرمایا تھا اگر میں
سب کے سامنے ایک بات کہتا اور خلوت میں دوسری تو یہ جھوٹ اور منافقت ہوتی۔
اعلاحضرت جب اندر سے تشریف لائے تھے تو انکی ایک مٹھی بند تھی۔ نواب صاحب کا جواب
سننے کے بعد اعلاحضرت نے مٹھی کھولی اور الماس کی ایک بیش قیمت انگوٹھی عطا فرمائی۔
نواب صاحب کے فرزند نواب مہدی یار جنگ نے مجھے وہ انگوٹھی دکھائی تھی۔

اب آپ اس شریف النفس اور ہر دلعزیز فرمانروا کے فرزند اور جانشین
آصف جاہ سابع میر عثمان علی خاں کا حال سنئے کہ اس نے نواب صاحب کی
راست گوئی کا کیا صلہ عطا فرمایا۔ کوئی راجہ (یہ مجھے یاد نہیں رہا کہ مہاراجہ پٹیالہ
یا مہاراجہ نابھہ یا کوئی اور) ریاست کے مہمان تھے۔ اعلاحضرت نے ان کے
اعزاز میں اپنے محل میں ایک بڑا ڈنر دیا۔ کھانے کے بعد باتوں باتوں میں مسئلہ ازدواج

پر بحث چھڑ گئی۔ اس میں کہیں اعلاحضرت نے یہ کہہ دیا کہ اسلام میں اس بارے میں بہت سہولت اور آزادی ہے۔ نواب صاحب نے فوراً ٹوکا کہ یہ صحیح نہیں ہے۔ "اسلام نے اس معاملہ میں ایسی کڑی شرط لگا رکھی ہے کہ آدمی ایک سے زیادہ بیویاں نہیں رکھ سکتا" شاہ دکن کو اختلاف کی تاب کہاں سخت برہم ہوئے اور طیش میں آکر فرمایا آپ یہاں سے چلے جائیے۔ نواب صاحب فوراً اٹھکر چلے آئے۔ دوسرے روز علی الصبح اعلاحضرت کے معتمد منشی غیاث الدین (انطہر جنگ) نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ اعلاحضرت نے فرمایا ہے کہ آپ ریاست حیدرآباد سے چلے جائیے اور آپ کو کونسل آف اسٹیٹ کی معتمدی کی جو تنخواہ اب تک ملتی رہی ہے وہ بھی واپس کر دیجئے۔ نواب صاحب نے کہا کہ وہ رقم بطور امانت بینک میں جمع ہے میں اس کا ایک حبہ بھی اپنے تصرف میں نہیں لایا۔ وہ آج ہی واپس کر دی جائے گی اور اسی روز حیدرآباد کو الوداع کہہ کر پونا تشریف لے گئے۔ یہ شخصی حکومت کے فرمانرواؤں کا ادنا نمونہ ہے۔ متلوّن، مغلوب الغضب، متکبر بے اصولے، گھڑی میں فرشتہ اور گھڑی میں شیطان۔ جو شخص انھیں یہ خط لکھتا ہے " عماد الملک بہادر فخر الاماثل والاقران۔ آپ کے ساتھ ہم کلامی و ہم طعامی نہ ہوکر ایک زمانہ گزر گیا ہے لہذا کل صبح دس بجے شریک بریک فاست ہوں تو باعث مسرت ہے" ایک اور خط میں نواب صاحب کے انڈیا کونسل سے مستعفی ہونے پر لکھتے ہیں " ایسی باوقعت خدمت سے دفعتہً استعفا دے دینا تمام مسلمانان ہند کے لیے ایک بدقسمتی کا باعث ہے۔ کیونکہ آپ جیسا مدبر صاحب رائے تجربہ کار واقف اسرار پھر دوسرا شخص اس خدمت پر مقرر ہونا بحالات سے معلوم ہوتا ہے . . . . . " یہ وہ الفاظ ہیں جن سے وہ اپنی ریاست کے بڑے سے بڑے امیر یا وزیر کو مخاطب نہیں کرتے۔ وہی شخص ان کو رجو ان کے استاد بھی ہیں، دربار سے نکال دیتا ہے اور دربار ہی سے نہیں حیدرآباد سے

خارج البلد کردیتا ہے۔

دوسرے روز جب صاحب رزیڈنٹ کو معلوم ہوا تو وہ اعلا حضرت سے ملے اور بہت افسوس کا اظہار کیا اور کہا کہ نواب عماد الملک معمولی شخص نہیں مسلمانان ہند کے دلوں میں ان کی بڑی عزت و وقعت ہے اور حکومت ہند بھی ان کو بڑی عزت کی نظر سے دیکھتی ہے۔ ان کے ساتھ جو ناروا برتاؤ ہوا ہے اس سے لوگوں میں آپ کی طرف سے بہت ناراضی اور بدگمانی پیدا ہو گئی ہے چنانچہ فوراً ان کو واپسی کا فرمان بھیجا گیا۔ وہ اس واقعہ سے بہت آزردہ خاطر ہو گئے تھے اور آنا نہیں چاہتے تھے لیکن اپنے فرزندوں اور احباب کے اصرار پر واپس آگئے جس روز حیدرآباد پہنچے تو اعلاحضرت نے فوراً ملاقات کے لئے طلب فرمایا۔ نواب صاحب نے کہلا بھیجا کہ میں تھکا ہوا ہوں اس وقت نہیں آسکتا۔ لیکن جب اعلا حضرت نے بہت اصرار کیا تو وہ کنگ کوٹھی گئے۔ دور ہی سے بلند آواز میں جیسا کہ ان کا قاعدہ ہے) مائی ٹیوٹر مائی ٹیوٹر کہہ کر استقبال کیا۔

انجمن کی معتمدی کے ابتدائی زمانے میں میں نے ایک عرضداشت بغرض امداد انجمن پیشگاہ اعلاحضرت میں پیش کی تھی۔ بارہ سو سالانہ امداد منظور ہوئی۔ نواب صاحب کو اس کا علم ہوا تو بہت ناخوش ہوئے اور مجھے لکھا " اسے قبول نہ کیجئے انکار کر دیجئے ریاست کے خزانے پر صاحب بہادر کا قبضہ ہے "۔ (اس وقت صدرالمہام فنانس سر ریجنالڈ گلانسی تھے) میں نے اسے خلاف مصلحت خیال کیا کیونکہ آئندہ بہت سی توقعات تھیں۔

حیدرآباد اس برعظیم کی سب سے بڑی اور باعظمت ریاست تھی۔ اس کی تہذیب اور روایات خاص تھیں۔ لوگ خوش حال تھے۔ سر سالار جنگ کے زمانے سے اس کے نظم و نسق میں بتدریج ترقی ہوتی گئی اور بیسویں صدی میں ہر اعتبار سے

عروج کو پہنچ گئی شخصی سلطنتیں سازش کا گھر ہوتی ہیں جنہیں یہاں خوب پھولتی پھلتی ہیں سر سالار جنگ بڑے مدبر تھے وہ ریاست کے ہر شعبے پر نظر رکھتے تھے اور ہر عہدہ دار سے اُسکی صلاحیت اور قابلیت کے مطابق کام لیتے اور ہر ایک کے کردار اور کام پر ایسی نظر رکھتے تھے کہ کسی کو اپنی حد سے تجاوز کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ ان کی وفات کے بعد چشم نگراں اُٹھ گئی اور سازشوں کا دروازہ کھل گیا۔ آپس کی کش مکش اور رقابت نے طرح طرح کی ریشہ دوانیوں پر ابھارا اور حریف ایکدوسرے کو گرانے کے لئے کذب و افترا بہتان اور اس سے بھی بدتر حربے استعمال کرنے سے نہ چوکتے تھے۔ سازشوں کا یہ جال ایسا پیچ در پیچ تھا کہ ماحول کے اثر یا ذاتی تعلقات کی بنا پر اس میں بعض ایسے اشخاص بھی پھنس جاتے تھے جن کا کوئی ذاتی فائدہ نہ ہوتا تھا۔ نواب عماد الملک کو اس قسم کی بعض سازشوں میں الجھانے کی بہت کوشش کی گئی لیکن وہ اپنے اصول پر قائم رہے اور ان کا دامن اُس وقت اور اس کے بعد بھی اس آلایش سے پاک صاف رہا۔

پاک ہیں آلائشوں میں بندشوں میں بے لگاؤ   رہتے ہیں دنیا میں سب کے درمیان سب سے الگ

انھوں نے اپنے ذاتی رسوخ اور اقتدار سے کبھی اقربا نوازی اور یار فروشی کا کام نہیں لیا۔ ایک بار اعلحضرت مرحوم کسی وجہ سے اپنے پیشی سیکرٹری (نواب امین جنگ) سے ناخوش ہو گئے اور نواب عماد الملک کو لکھا کہ میں امین جنگ کی جگہ آپ کے فرزند محمد ہاشم کو مقرر کرنا چاہتا ہوں۔ نواب صاحب نے لکھا کہ وہ اس کام کے اہل نہیں۔ مناسب یہ ہوگا کہ حضور امین جنگ ہی کو ان کی سابقہ خدمت پر بحال فرمادیں۔ معتمد پیشی کی خدمت (جو بعد میں صدر المہامی پیشی ہو گئی) ایسے اعزاز اور اقتدار کی خدمت تھی کہ ریاست کا کوئی دوسرا عہدہ دار اسے نعمت غیر مترقبہ سمجھ کر کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیتا۔ ایک دوسرے موقع پر حضور نظام نے لکھا کہ میں آپ کے فرزند عقیل جنگ کو کوتوال شہر کی خدمت پر مامور کرنا چاہتا ہوں۔ اس زمانے میں کوتوال شہر کی قوت د

اقتدار کا مقابلہ کوئی عہدہ دار تو کیا کوئی امیر یا وزیر بھی نہیں کر سکتا تھا۔ نواب صاحب نے صاف لکھ بھیجا کہ عقیل جنگ اس کام کے اہل نہیں کسی دوسرے شخص کا انتخاب فرمایا جائے۔

ان کے سامنے اور ان کے بعد بہت سے بڑے بڑے اشخاص آئے اور چلے گئے لیکن نواب عماد الملک نہایت عزّت و آبرو کے ساتھ آخر تک حیدر آباد میں رہے اور ہر دور میں ان کا اعزاز پہلے سے زیادہ ہوتا رہا۔ برٹش انڈیا اور گورنمنٹ آف انڈیا میں بھی ان کا ایسا ہی اعزاز تھا۔ چنانچہ لارڈ کرزن نے جو یونی ورسٹی کمیشن ہندستان کی یونی ورسٹیوں کے حالات کی تنقیح اور اصلاح کے لئے بہ صدارت سر ٹامس ریلے مقرر کیا تھا اسکے ایک رکن نواب صاحب بھی منتخب کئے گئے تھے۔ اس سلسلے میں پورے ہندستان کا دورہ کیا۔ ۱۹۰۲ء میں بہ عہد لارڈ کرزن امپیریل لیجس لیٹو کونسل کے ممبر منتخب ہوئے۔ ۱۹۰۷ء میں لارڈ مارلے نے پہلی بار وزیر ہند کی کونسل کے لئے دو ہندستانی ممبروں کا انتخاب کیا۔ ان میں ایک نواب عماد الملک تھے۔

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے دو بار صدر منتخب ہوئے۔ ایک بار ۱۸۹۵ء میں میرٹھ کے اجلاس میں بزمانہ سر سید اور دوسری بار جب ۱۹۰۰ء میں کانفرنس کا اجلاس رام پور میں ہوا۔ ۱۹۱۲ء میں مدراس یونی ورسٹی کے کانووکیشن (جلسۂ تقسیم اسناد) میں خطبۂ صدارت پڑھا۔

مجھے یہ دیکھ کر بعض اوقات تعجب ہوتا اور مزہ بھی آتا (نئی امت کا ذکر نہیں) کہ ابتدا میں جن بزرگوں نے انگریزی معاشرت کی گرویدگی کا اظہار کیا تھا اور اپنے رہنے سہنے میں بہت کچھ تبدیلی کرلی تھی وہ کھانا اپنا ہی کھاتے تھے۔ سر سید احمد خاں، نواب محسن الملک نواب عماد الملک کے دستر خوانوں کا میں نے یہی رنگ دیکھا۔ ظاہر ہے کہ انگریزی ابلے ہوئے کھانوں میں وہ ذائقہ اور چٹخارہ کہاں جو ہمارے کھانوں میں ہے؟ اب تو لوگ وہ کھانے بھول گئے، نام تک یاد نہیں۔ نہ ان کے پکانے

ولے رہے اور نہ پکانے والوں کے قدردان ۔ اب جو کھانے ہم کھاتے ہیں وہ نہ
انگریزی ہیں نہ مغلئی ۔ یوں کھانا سب ہی کھاتے ہیں لیکن ان میں کتنے ہیں جو کھانے
کا ذائقہ لطافت اور آب و نمک کا صحیح ذوق رکھتے ہوں ۔ نواب عماد الملک بہت
نفیس اور لذیذ کھانا کھاتے تھے لیکن ان کے کھانے بہت مرغن ہوتے تھے ۔ خدا
جانے یہ لوگ یہ کھانے کس طرح ہضم کر لیتے تھے جب کہ کسی قسم کی ورزش کے بھی
عادی نہ تھے ۔ ایک بار وہ مجھے اپنے ساتھ وقار آباد لے گئے جہاں ان کا ایک
اچھا سا باغ اور بنگلہ تھا ۔ کھانا ان کے ساتھ کھانا پڑا ۔ شب کے کھانے پر وہ
بار بار ٹوکتے تھے کہ کیسے جوان ہو تم سے تو میں بڈھا ہی اچھا ہوں ، تم سے دگنا
کھاتا ہوں ۔ ان کے اصرار پر بھی میں نے کھانا بہت احتیاط سے کھایا لیکن یہ مرغن
کھانا جس میں مغزیات بھی تھے مجھے راس نہ آیا اور رات بھر بے چینی رہی ۔ صبح ہوتے
ہی میں نے وہاں سے نکل بھاگنے کی ٹھانی ۔ مگر نواب صاحب نے جانے نہ دیا ۔ اور
ٹھیرنے پر اس قدر اصرار کیا کہ میں مجبور ہو گیا ۔ کھانا میرے سامنے آتا تو میرے
رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے ۔ نواب صاحب میرے کم کھانے پر ہنستے اور طعن کرتے
تھے ۔ انھیں کیا خبر کہ مجھ پر کیا بنی ہوئی ہے ۔ تیسرے دن تو میں نے ایک نہ سنی
اور حیدر آباد جا کر ہی دم لیا ۔ نواب صاحب کھانا تو خیر اچھا کھاتے ہی تھے لیکن
کھانے کی خوبی اور اس کی باریکیوں کو بھی خوب سمجھتے تھے ۔ بعض چیزیں خود بھی پکاتے
تھے ۔ خاص کر ارہر کی دال جس میں کمرخ کی لاگ دیتے تھے بہت لذیذ ہوتی تھی ۔
قدردان بھی ایسے ہی تھے ۔ ایک روز جو میں ان کے ہاں گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ
ایک صاحب ان کے ساتھ صوفے پر بیٹھے ہیں اور وہ ان سے بے تکلف باتیں کر رہے
ہیں جس وقت میں پہنچا تو نواب صاحب ان سے کھانے کی تعریف کر رہے تھے
اور کہہ رہے تھے کہ میٹھے چاول تم نے خوب پکائے تھے لیکن شکر ہی تھی ۔ نئی شکر

گرم ہوتی ہے۔ اس نے کہا آپ نے صحیح فرمایا اس وقت پرانی شکر نہ مل سکی نئی استعمال کرنی پڑی معلوم ہوا کہ یہ حضرت بکاول تھے۔ نواب صاحب کے ملاقاتیوں میں دو چار ہی ایسے تھے جو ان کے ساتھ ایک صوفے پر بیٹھ کر اس طرح باتیں کرتے۔ کمال کی قدر ہو تو ایسی ہو۔

ان کے خاص دوست اور ملنے والے بہت کم تھے۔ مگر جس سے جو ربط تھا وہ خلوص کے ساتھ تھا۔ وہ اہل علم سے مل کر بہت خوش ہوتے تھے اور ایسے اشخاص پر جن میں طالب علمانہ جستجو اور صحیح ذوق ہوتا بہت مہربان ہوتے اور ان کے لیے جو کچھ بھی ممکن ہوتا کرنے کو تیار ہو جاتے تھے جس کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں۔

پرانے لوگوں میں ایک بات یہ بھی تھی کہ جس پر ایک بار اعتبار کر لیا بس اسکے ہو گئے۔ ہزار کوئی اس کے خلاف کہے وہ نہیں سنتے تھے۔ یہی کیفیت سر سید احمد خاں کی تھی اسی اعتماد کا نتیجہ تھا کہ انکے انگریزی کلارک نے ایک لاکھ کا غبن کر دیا۔ نواب صاحب کے دفتر میں انکے ایک مددگار عبداللہ بیگ صاحب تھے میں نے ایک روز نواب صاحب سے کہا کہ اس شخص کی دیانت مشتبہ ہو اور جہاں تک معلوم ہوا ہے یہ آدمی اچھا نہیں ہے۔ یہ سنکر بہت برہم ہوئے اور کہنے لگے جو ایسا کہتے ہیں وہ خود ایسے ہیں۔ وہ بہت اچھا آدمی ہے لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد جب دفتر کے حسابات کی تنقیح ہوئی تو معلوم ہوا کہ وہ بہت سا سرکاری روپیہ اپنے تصرف میں لے آیا ہے اور غبن کے الزام میں خدمت سے برطرف کر دیا گیا۔ اس تذکرے سے یہ مقصد نہیں کہ ان کے معتمد علیہ ایسے ہی تھے بعض اشخاص جن پر ان کو اعتماد تھا درحقیقت اپنی سیرت کردار اور قابلیت کے اعتبار سے بہت قابل قدر تھے۔

مذہباً شیعہ تھے لیکن اہل تشیع کے بعض عقائد مثلاً تبرّے اور تقیّے کے سخت مخالف تھے اور کہتے تھے کہ جاہلوں کے عقیدے ہیں۔ نواب رام پور مرحوم (حامد علی خاں) جیسا کہ میں اوپر لکھ چکا ہوں نواب عماد الملک بہادر کا بیحد ادب و احترام کرتے تھے۔ ایک

ملاقات کے وقت جب ان کا ذکر آیا تو کہنے لگے کہ ایک بات میں ہمیں ان سے اختلاف
ہے اور کسی طرح وہ اس معاملے میں ہم سے اتفاق کرنے پر آمادہ نہیں۔ دریافت
کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ اختلافی معاملہ تقیہ کا تھا۔ حالانکہ ہم نے بعض شیعہ علما اور
نہایت قابل اور روشن خیال اشخاص کو یہ کہتے سنا ہے "التقیۃ دینی و دین آبائی"
مگر وہ نہایت بے تعصب شخص تھے کسی مذہب یا مذہبی فرقے سے مطلق کسی قسم کا
تعصب نہیں رکھتے تھے۔ مولانا عبدالحلیم شرر لکھتے ہیں کہ مولوی شبلی نعمانی مجھ سے
کہتے تھے کہ میں نے الفاروق کو شائع کیا تو اس کا ایک نسخہ نواب عمادالملک بہادر
کی خدمت میں بھیجا اور ان سے خواہش کی کہ اس کی نسبت آپ اپنے خیالات ظاہر فرمائیں
اس کے جواب میں انھوں نے تحریر فرمایا کہ گزشتہ تیرہ سو برس میں صرف ایک شخص پیدا
ہوا جس کا نام عمر ابن الخطاب ہے۔ لہذا ان کی لائف لکھنا اسلام کی خدمت تھی
جو آپ نے ادا کی" سررشتہ تعلیم بہت وسیع محکمہ ہوا اور سینکڑوں آدمیوں کا تقرر
ان کے ہاتھ میں تھا لیکن انھوں نے کبھی مذہبی پاسداری سے کام نہیں لیا۔ اس
معاملہ میں بہت فراخ دل تھے۔ بعض عیسائی مشنریوں اور دوسرے غیر اسلامی اداروں
کو جو اشاعت تعلیم کا کام کرتے تھے وقتاً فوقتاً مدد دیتے تھے۔

آخر زمانے میں انھیں مذہب سے خاص لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ گفتگو میں اکثر
محاسن اسلام کا ذکر کرتے تھے اور افسوس کیا کرتے تھے کہ لوگ اصول سے زیادہ
فروع پر زور دیتے ہیں اور توہمات کو مذہب سمجھ رکھا ہے۔ کہتے تھے اصل اسلام
اہل حدیث (وہابیوں) کا ہے۔ یہ اثر ان پر زمانہ طفولیت سے تھا جب کہ وہ اپنے والد
کے ساتھ بنگال کے مختلف اضلاع میں رہے۔ اس زمانے میں شاہ اسماعیل شہید
علیہ الرحمۃ کے بے لوث سرفروش داعی اور واعظ اشاعت اسلام کی خاطر بنگال کے
اضلاع کا دورہ کرتے تھے۔ وہ کبھی کبھی ان کے ہاں آکر مہمان رہتے۔ اور ان کے

والدان کی بہت خاطر مدارت کرتے۔ نواب صاحب کہتے تھے کہ یہ لوگ کشتیوں میں سفر کرتے اور اسلام کی تبلیغ کرتے تھے۔ ان بزرگوں نے گاؤں کے گاؤں مسلمان کر لیے تھے۔ یہ نومسلم بڑے مخلص اور پکّے مسلمان تھے جس وقت نماز کا وقت آتا فوراً سب کام چھوڑ چھاڑ کر نماز کے لئے کھڑے ہو جاتے۔ مثلاً کھیت میں کوئی ہل چلا رہا ہے تو اذان سنتے ہی ہل جہاں تھا وہیں رہ جائے گا۔ یا کسی اور کام میں مصروف ہے تو کام جس نوبت پر ہو وہیں چھوڑ دیا جاتا۔ یہ اپنے عقائد میں بہت راسخ تھے مجال نہ تھی کوئی شخص قبر پہ پھول چڑھائے یا اسی قسم کی اور بدعت کرے۔ اس بات پر بہت افسوس کرتے تھے کہ ان مخلص مجاہدوں کے بعد جب پنجاب کے جاہل اور دنیا دار پیروں نے آنا شروع کیا تو بیچارے بنگالی مختلف قسم کے توہمات اور بدعتوں میں پھنس گئے۔ شاہ اسماعیل شہید کے تقویٰ اور سچے اسلامی جوش کے بہت قائل تھے لڑکپن کا یہ اثر ان کے دل پر آخر عمر تک تازہ رہا۔

جیسا کہ میں نے ابھی لکھا ہے آخر زمانے میں اسلام کی حقانیت اور قرآن پاک کی تعلیم کی عظمت ان کا تکیہ خیال ہو گئی تھی۔ ان چیزوں کو وہ طرح طرح سے بیان کیا کرتے تھے۔ ایک روز مولانا انوار اللہ خان صاحب (فضیلت جنگ) صدر الصدور سے قرآن مجید کی فصاحت کے بعض نکات بیان کر رہے تھے۔ دوران گفتگو میں فرمایا کہ لوگوں نے الفاظ قرآن پاک کی موسیقیت اور ترنم کی طرف بہت کم توجہ کی ہے اور اسی ضمن میں کہا کہ آیۃ الکرسی کے الفاظ میں ایسی حسن ترتیب ہے کہ وہ پیانو پر ادا کیے جا سکتے ہیں۔ اسلام کی تبلیغ کو بہت بڑی اسلامی خدمت سمجھتے تھے۔ اسی بنا پر وہ خواجہ کمال الدین کی بہت عزت کرتے تھے۔ اور خواجہ صاحب اور ان کے رفقا نے تبلیغ کا کام جو مختلف ممالک میں کیا اس کے بہت ثنا خوان تھے۔ غالباً انھیں کی تحریک پر سرکار سے خواجہ صاحب کو مالی امداد بھی دی گئی۔

ایک روز مجھ سے کہنے لگے کہ ہندستان کا آیندہ سربراہ (لیڈر) مذہب کے بھیس میں آئے گا۔ کچھ مدت بعد جب گاندھی جی میدان سیاست میں جلوہ فرما ہوتے تو مجھے نواب صاحب کی پیش گوئی یاد آئی۔ اس سے قبل انڈین نیشنل کانگریس انگریزی تعلیم یافتہ حضرات کے تصرف میں تھی، عوام سے کوئی رابطہ نہ تھا۔ گاندھی جی اپنی قوم کے مزاج کو خوب پہچانتے تھے۔ انھوں نے یک لخت اپنی طرز زندگی اس طرح بدل دی جیسے سانپ اپنی کیچلی بدل دیتا ہو۔ وہ ننگے سر ننگے پاؤں رہتے گھٹنوں سے اوپر ایک عزقی سی باندھ لیتے اور کندھے اور سینہ چھپانے کے لئے کھدر کا بڑا سا رومال یا چھوٹی سی چادر ڈال لیتے۔ اس کے بعد سے ان کی زندگی درویشانہ اور زاہدانہ ہوگئی۔ اور وہ دفعۃً کرم چند موہن داس گاندھی سے مہاتما گاندھی ہوگئے۔ ہندو خلقت ان کی پوجا کرنے لگی اور ان کے ایک ایک لفظ کو الہام ربانی سمجھنے لگی۔ کانگریس کا دروازہ سب کے لئے کھل گیا۔ انگریزی کی جگہ ہندی ہندستانی اردو میں تقریریں ہونے لگیں۔ ہندو تو ہندو مسلمانوں کو خلافت کے لاسے پر ایسا لگایا کہ ان کے سرگروہ اور علما گاندھی جی کا دم بھرنے لگے۔ گاندھی جی نے مذہب کو سیاست میں ایسا سمویا کہ وہ تھوڑے سے عرصے میں ہندستان کے مادی اور روحانی پیشوا ہوگئے۔

خطوں کا جواب بالالتزام دیتے تھے اور اپنے قلم سے لکھتے تھے کبھی دوسرے سے نہیں لکھواتے تھے اور کبھی فونٹین پن استعمال نہ کیا۔ اپنی تمام تحریریں اردو انگریزی سب خود لکھیں اور اپنے قلم سے لکھیں ایسے زمانے میں بھی جب وہ ضعیف ہوگئے تھے اور کسی قدر ضعف بصارت کا بھی عارضہ تھا انھوں نے کبھی اپنے خط یا اپنی تحریریں کسی دوسرے سے لکھوانی گوارا نہ کیں۔

میانہ قد کھلا گندمی رنگ خوبرو آدمی تھے۔ خضاب کرتے تھے۔ آخر زمانے میں ترک کر دیا تھا۔ سفید ڈاڑھی بھلی معلوم ہوتی تھی۔ زبان میں ہلکی سی لکنت تھی۔

جامہ زیب تھے۔ ہمیشہ ہندستانی یعنی حیدرآبادی لباس پہنتے تھے۔ جب لیجس لیٹو کونسل کے ممبر ہوئے تو لباس میں تبدیلی کرنی پڑی لیکن یہ تبدیلی عارضی تھی۔ انڈیا کونسل کے ممبر مقرر ہوئے اور لندن میں رہنا ہوا تو انگریزی لباس اختیار کرنا پڑا۔ ان کے قوا بہت اچھے تھے صحت قابل رشک تھی۔ لندن میں ایک حادثے سے ٹانگ میں چوٹ آگئی۔ زخم اچھا ہوگیا مگر ہڈی کا جوڑ ٹھیک نہ بیٹھا۔ اس سے انھیں اٹھنے بیٹھنے میں تکلیف رہتی تھی۔ اگر یہ صدمہ نہ ہوتا تو کئی سال اور زندہ رہتے۔ پھر بھی ۸۳ برس کی عمر پائی کبھی کبھی بے تکلف دوستوں کے ساتھ شطرنج بھی کھیل لیتے تھے کسی زمانے میں ستار کا بھی شوق تھا۔

ان کی یادگار یہ چند تصانیف ہیں۔

۱۔ سوانح سر سالار جنگ۔ یہ نواب سر سالار جنگ کی مختصر سوانح عمری ہے، انگریزی زبان میں ہے ۔۔۔ ۱۳۰۰ ہجری میں جو نواب صاحب کی وفات کا سال ہے لکھی گئی۔ سر سالار جنگ ان کے محسن تھے اور ان کا ذکر بڑے خلوص اور محبت سے کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ سیاست دانی معاملہ فہمی مردم شناسی اور قدردانی میں اورنگ زیب کے بعد کوئی شخص ہوا ہے تو وہ سر سالار جنگ تھے۔ اس کا ترجمہ اردو میں بھی ہوگیا تھا۔

۲- DESCRIPTIVE-SKETCHES OF THE NIZAM'S DOMINION

اس میں ریاست حیدرآباد دکن کے جغرافی تاریخی واقعات، انتظامی حالات، ریاست کی صنعت و حرفت وغیرہ کا دلچسپ بیان ہے اس کتاب کی تالیف میں مسٹر ڈبلیو ولمٹ بھی شریک تھے۔ یہ کتاب دو ضخیم جلدوں میں ہے۔

۳۔ رسائل عماد الملک۔ اس میں نواب صاحب کے وہ تمام مضامین خطبات و مقالات ہیں جو وقتاً فوقتاً اردو میں تحریر کئے۔

۴۔ انگریزی مضامین، مقالات و خطبات اور انگریزی نظموں کا مجموعہ۔

۵۔ قرآن پاک کا ترجمہ۔ یہ نواب صاحب کا سب سے اہم اور قابل قدر کام ہے۔ یہ ترجمہ آپ نے نہایت تحقیق و کاوش اور محنت سے کیا تھا اور اس کے لئے خاص اہتمام کیا تھا اور ایک بڑا ذخیرہ تفاسیر و احادیث اور لغات اور علمائے ادب کی تصانیف کا جمع کر لیا تھا۔ ان کی کوشش یہ تھی کہ ترجمے میں حتی الامکان اصل کی سی سادگی، شان اور قوت باقی رہے۔ مزاج میں بڑی احتیاط تھی۔ بہت غور و فکر کرتے اور ایک ایک لفظ کو جانچتے اور تولتے تھے۔ اس کے ساتھ لفظی پابندی کا بھی خیال رکھتے ان کی پیش نظر بائبل کا انگریزی ترجمہ تھا۔ سولہ پاروں کا ترجمہ مکمل کر لیا تھا اور بطور پروف کے چھپوا بھی لیا تھا۔ نظر ثانی کے وقت مولوی حمید الدین صاحب سے بھی مشورہ کرتے تھے۔ افسوس کہ بوجہ کبر سنی ضعف بصارت اور ٹانگ کے صدمے کی وجہ سے یہ کام جو ان کے فضل و کمال کا بہترین نمونہ تھا جاری نہ رہ سکا۔

نواب عماد الملک بہادر کی شخصیت اس زمانے میں بعض اعتبار سے عجیب سی معلوم ہوگی۔ وہ مشرقی اور مغربی تہذیب کے جامع تھے۔ آدمی کو علم، دولت، آسائش و آرام محنت سے مل جاتا ہے۔ لیکن صحیح ذوق بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ یہ دولت نہ علم سے ملتی ہے نہ مال و زر سے اور نہ محنت سے۔ صحیح ذوق زندگی کی جان ہے۔ اس سے زندگی کے ہر شغل و شعبہ میں ایک نرم اور سہانی سی روشنی آجاتی ہے، اور باوجود نشیب و فراز اور اوگھٹ گھاٹیوں کے سفر حیات کے طے کرنے میں بہت کچھ سہولت ہو جاتی ہے۔ حسن ذوق نواب عماد الملک کی زندگی کے تقریباً ہر پہلو میں پایا جاتا ہے۔ ان کی طرز معاشرت اور ظاہری شان ایسی تھی کہ لوگ ان کے پاس جاتے ہوئے ہچکچاتے تھے۔ وہ ایسے لوگوں سے جو ذوق علم اور ذوق تہذیب سے عاری ہوتے گو دنیاوی حیثیت سے ان کا پایہ کتنا ہی بلند ہوتا ملنے سے ابا کرتے۔ ایسے

اصحاب سے ان کا برتاؤ خشک اور اجٹتا ہوا ہوتا تھا۔ لیکن اہل علم کی ملاقات سے بہت خوش ہوتے اور ان سے گھل مل کے باتیں کرتے۔ ان ملاقاتوں میں طالب علمانہ سادگی خلوص اور ہمدردی پائی جاتی تھی۔ وہ غریب سے غریب عالم یا طالب علم کے مقابلے میں بڑے سے بڑے جاہل امیر کی کچھ حقیقت نہیں سمجھتے تھے۔ انھوں نے علم و ادب کی اشاعت اہل علم اور علمی اداروں کی امداد و سرپرستی میں ہمیشہ فراخ دلی سے کام لیا اور اس سے ان کو سچی خوشی ہوتی تھی۔ وہ صادق القول با وضع اور پابند اصول تھے۔ ان میں قدیم وضع اور جدید تہذیب کی بعض خوبیاں اس خوش اسلوبی سے باہم ملی ہوئی تھیں کہ اس امتزاج نے ان کی روش زندگی میں ایک قسم کا حسن پیدا کر دیا تھا۔

ان کی صحبت مغتنمات میں سے تھی۔ اس میں حکیمانہ اور طالب علمانہ دونوں شانیں نظر آتی تھیں۔ اپنے زمانے کے پرانے حالات اپنے بزرگوں کی خودداری وضع داری اور شجاعت کے کارنامے اور ان کے توہمات اسراف اور شیخی کے قصے بڑے مزے سے بیان کرتے تھے۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ قدیم اساتذہ کے کلام پر بہت اچھی نظر تھی اور خاص صحبتوں میں ان کا منتخب کلام سناتے اور کبھی کبھی شعر کے محاسن و معائب پر تنقیدی نظر ڈالتے جسے سن کر ان کے ذوق کی داد دینی پڑتی تھی۔ اگر کوئی ان چیزوں کو قلمبند کر لیتا تو وہ ایک نادر بیاض ہوتی۔ مولانا حالی فرماتے ہیں کہ مظہر جان جاناں رح نے اساتذہ کے کلام سے منتخب اشعار کا ایک مجموعہ مرتب کیا تھا جس کا نام "خریطۂ جواہر" تھا۔ اس کا دلی کی شاعری پر بہت اچھا اثر پڑا۔ پرانے صاحب ذوق اور پڑھے لکھے حضرات اپنے پاس ایک بیاض رکھتے تھے جہاں کہیں کوئی اچھا شعر یا کوئی خیال یا کام کی بات نظر پڑی یا کوئی مجرب نسخہ ہاتھ لگا وہ جھٹ اپنی بیاض میں لکھ لیتے تھے۔ غرض نواب عماد الملک کی صحبت میں بعض اوقات ایسے علمی و ادبی نکات مل جاتے تھے جو گھر سے مطالعہ اور

فکر کا نتیجہ ہوتے تھے۔ ان کے علمی ذوق علم وادب کی سرپرستی اور صحبت سے جو فیض لوگوں کو پہنچا وہ ان کی تالیفات سے کہیں زیادہ استوار اور دور رس تھا۔

وہ جس خدمت پر مدت دراز تک فائز رہے اگرچہ اس میں ایک گونہ ترقی ہوئی لیکن جیسی ہونی چاہئے تھی وہ نہ ہو سکی۔ اس کا انھیں خود بھی اعتراف تھا۔ اس کی وجہ ہے۔ ان کاموں کے لئے جدوجہد کی ضرورت ہوتی ہے۔ اپنے سررشتہ کے منصوبوں اور تجویزوں کی منظوری کے لئے بہت سے جتن کرنے پڑتے ہیں کبھی اپنے اعلا افسروں سے مل کر اور ان کو خوش کر کے کام نکالنا پڑتا ہے اور کبھی لڑ جھگڑ کر اور اپنے رسوخ سے کام لے کر منظوریاں حاصل کرنی پڑتی ہیں۔ نواب عماد الملک اس قدر خوددار اور غیور اور اپنے اعلا افسروں سے اس قدر بلند مرتبہ تھے کہ اس قسم کی ربڑ اور دوڑ دھوپ یا اپنے افسروں کی خوشنودی کی کوشش ان کے امکان سے باہر تھی۔

ان کے علم فضل، وسیع معلومات علمی و ادبی ذوق اور عربی فارسی انگریزی اور فرانسیسی زبانوں کے گہرے مطالعہ کو دیکھتے ہوئے ان کا علمی کام اس توقع سے کم ہے جو ان سے کی جاتی تھی۔ حیدرآباد کے انوکھے حالات اور ماحول آئے دن کے تغیرات نے بیزاری اور نئی طرز معاشرت نے تن آسانی پیدا کر دی تھی۔ کام کا وہ ولولہ جو ابتدا میں تھا بعد میں نہ رہا۔ لیکن بے دریغ علمی سرپرستی، علمی فیض رسانی فاضلانہ استغنا، اعلا سیرت اور بے لوث کردار کی وجہ سے وہ دولت آصفیہ حیدرآباد دکن کی تاریخ میں ہمیشہ عزت کے ساتھ یاد رہیں گے۔

سٹوڈنٹس انگلش اُردو ڈکشنری

یہ اسٹینڈرڈ انگلش اُردو ڈکشنری مرتبہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب معتمد اعزازی انجمن ترقی اُردو کا اختصار ہی، لیکن باوجود اختصار کے ہمہ وجوہ مکمل اور جامع ہی۔ بڑی کتاب میں سے صرف وہ الفاظ جو قدیم اور متروک ہیں اور ادب میں مستعمل نہیں یا ایسی اصطلاحات جو کسی خاص فن سے مخصوص ہیں اور عام طور پر ادب میں کام نہیں آتیں، خارج کر دی گئی ہیں۔ بعض الفاظ کے معنی میں جو غیر ضروری مترادف تھے وہ بھی نکال دیئے گئے ہیں۔ اس سے لغت کی جامعیت اور خوبی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ایک اعتبار سے یہ لغت زیادہ صحیح اور مکمل ہی۔ کیونکہ بڑی کتاب کے بعد تیار ہوئی ہی اور اس میں جو کہیں کہیں خامیاں رہ گئی تھیں وہ اس میں دُرست کر دی گئی ہیں اور بعض الفاظ کے خاص معنی جو بعد میں معلوم ہوئے اضافہ کر دیئے گئے ہیں۔

کالجوں اور مدارس کے طالب علموں، عام پڑھنے والوں، نیز مترجموں کے لیے یہ ڈکشنری بہت کارآمد ثابت ہوگی۔ کیونکہ اب تک کوئی انگریزی اُردو ڈکشنری اس جامعیت و صحت کے ساتھ ہماری کسی زبان میں نہیں لکھی گئی۔

ضخامت ۱۵۰۰ صفحات۔ قیمت ساڑھے بارہ روپے۔

پھول بن

مثنوی پھول بن دکھنی منظومات میں خاص اہمیت کی حامل ہے۔ حالانکہ یہ ایک بہت ہی مختصر مثنوی ہے۔ لیکن اس کے مطالعہ سے اس وقت کے طرز بیان اور دکھنی اُردو زبان کی کیفیت کا پورا پورا پتہ چلتا ہے اور گیارھویں صدی (ہجری) میں دکھنی اردو ادب، بالخصوص اُردو شاعری، کی ترقی اور اس کی خوبیوں کی حقیقی وضاحت ہوجاتی ہے۔ مزید برآں پھول بن میں وہ تمام لسانی خصوصیات موجود ہیں جو ایک اعلیٰ پایہ کے کلام میں متوقع ہیں۔ مثلاً جہاں صنائع و بدائع کے عمدہ نمونے اور تشبیہات و استعارات کے بہترین استعمال کی مکمل صورتیں نظر آتی ہیں، وہاں علاقائی تاثرات کا پورا پورا نقشہ بھی سامنے آجاتا ہے۔ مثال کے طور پر ان الفاظ کے صحیح استعمال پر غور کیا جائے جو خالص بھاشا اور مرہٹی زبانوں سے ماخوذ ہیں۔ اور یہ سب خوبیاں اُردو ادب و شاعری کے عروج و ترقی کے نقطۂ نظر سے بہت ہی اہم ہیں۔

پھول بن کا مصنف ابن نشاطی قطب شاہی سلطنت کے دارالخلافہ گول کنڈہ کا رہنے والا تھا۔ یہ بتا دینا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ پھول بن ابن نشاطی کے عہد جوانی کا سب سے پہلا شعری کارنامہ ہے۔ اس کا سال تصنیف ۱۰۷۶ھ ہے۔

ملنے کا پتہ :-

مینیجر انجمن ترقیٔ اُردو پاکستان، اُردو روڈ کراچی

تاریخ مسلمانانِ پاکستان و بھارت

از مولوی سید ہاشمی صاحب فرید آبادی

جلد اوّل "عہد کشورکشائی" محمد ابن قاسم سے اورنگ زیب تک مع مقدمہ زمانۂ قبل از اسلام۔ اسلامی ہند کی معرکتہ الآرا تاریخ، واقعات کی تحقیق و ترتیب اور بیان کی خوبی کے اعتبار سے غالباً ایسی کوئی کتاب اس موضوع پر اردو زبان میں نہیں لکھی گئی۔ اس میں نہ صرف اسلامی فتوحات و آبادکاری کا ذکر ہی بلکہ ان کے تمدن و معاشرت اور اقتصادی اور تہذیبی احوال کا بھی بیان ہی۔ ضخامت چھ سو صفحات۔ جلد کپڑے کی، گرد پوش رنگین۔ قیمت ساڑھے سات روپے۔

جلد دوم۔ آٹھ روپے آٹھ آنے۔

نیا ادب

مصنفہ پنڈت کرشن پرشاد کول (رکن سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی لکھنؤ) کے مضامین کا مجموعہ ہی۔ اس میں فاضل مصنف نے اردو کے جدید ادیبوں پر تنقیدی نظر ڈالی ہی۔ کول صاحب کی نظر بڑی گہری اور رائے جچی تلی ہوتی ہی۔ نئے ادب پر ایسی بے لاگ تنقید شاید اب تک نہیں لکھی گئی۔ قیمت چار روپے آٹھ آنے۔

منیجر انجمن ترقی اردو پاکستان، اردو روڈ کراچی

مصنفہ مولوی بدرالدین حیٰ فاضل جامعۂ ازہر (مصر) و بی۔ اے جامعہ ملیہ اسلامیہ (دہلی)

مصنف چینی مسلمان ہیں۔ عربی، فارسی، انگریزی، اردو زبانوں سے پوری واقفیت رکھتے ہیں۔ اور چینی تو ان کی مادری زبان ہے۔ یہ ایک محققانہ تالیف ہے۔ فاضل مؤلف نے اس کتاب کے لکھنے میں چینی، عربی، فارسی، اُردو اور یورپی زبانوں کے تمام مستند ماخذوں سے مدد لی ہے۔ عرب اور دیگر ممالکِ اسلامیہ کے ساتھ چین کے تعلقات اور ان کے ملّی اور عمرانی اثرات پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ کتاب میں آٹھ باب ہیں۔ شروع میں چین و عرب کے تعلقات قبل از اسلام کا ذکر ہے۔ باقی ابواب میں سیاسی، تجارتی، دینی، سفارتی صنعتی و فنّی تعلقات کا تفصیلی تذکرہ ہے۔

اس کتاب کے مطالعہ سے مسلمانوں کی تاریخ کا ایسا باب سامنے آجاتا ہے۔ جس کے بارے میں ہماری معلومات بہت کم بلکہ نہ ہونے کے برابر تھیں۔

قیمت مجلد چھ روپے آٹھ آنے غیر مجلد چھ روپے۔

مینجر انجمن ترقّی اُردو پاکستان

اُردو روڈ۔ کراچی ۱